ضبط کن تاریخ را پایندہ شو
از نفس ہائے رمیدہ زندہ شو!

مُسلمان تاریخ نویس

شیخ سعید اختر

ایم اے اسلامیات ، ایم اے سیاسیات

(گولڈ میڈلسٹ)

پروفیسر گورنمنٹ ڈگری کالج لائل پور (سمن آباد)

★

ناشر

قومی کتب خانہ ، لاہور

مُسلمان تاریخ نویس

مصنّف : پروفیسر سعید اختر

ناشر : محمد احسن ہمایوں
برائے قومی کتب خانہ، لاہور

طابع : نسیم ہمایوں

مطبع : تعمیر پرنٹنگ پریس
۱۹۔ فیروزپور روڈ، لاہور

تعداد : دو ہزار ۲۰۰۰

قیمت : آٹھ روپے ۸/-

دسمبر ۱۹۷۶ء

انتساب

"میں اپنی یہ ناچیز تالیف، نویں صدی ہجری کے نامور مؤرّخ علّامہ شمس الدین سخاوی (م ۹۰۲ھ) کے نام معنون کرتا ہوں۔ جن کی تالیف "اعلان بالتوبیخ لمن ذمّ اہل التواریخ" مسلمانوں کی تاریخ نویسی کی پہلی مجمل تاریخ ہے اور اس شعبۂ علم کی افادیت و اہمیّت ثابت کرنے میں حرفِ آخر کا درجہ رکھتی ہے۔"

سعید اختر

فہرست مندرجات

تقریظ

جناب پروفیسر غلام احمد حریری صاحب
اسلامی یونیورسٹی بہاولپور

لُغت میں وقت سے آگاہ کرنے کو "تاریخ" کہتے ہیں یعنی کسی چیز کے وقوع پذیر ہونے کا وقت بتانے کو لغتہً "تاریخ" کا نام دیا جاتا ہے۔ تاریخ کا لفظ اصلاً عربی ہے لیکن بعض عُلمائے لسانیات کے نزدیک یہ لفظ خالص عربی نہیں ہے بلکہ معرب ہے اور فارسی کے "ماہ و روز" سے ماخوذ ہے۔ فارسی میں "ماہ" چاند کو اور "روز" دن کو کہتے ہیں گویا دن اور رات تاریخ کے دھارے کے دو کنارے ہیں۔ یہ تاریخ کا لغوی مفہوم تھا۔

اصطلاح میں تاریخ اس وقت کے بتانے کا نام ہے جس سے راویوں کے احوال وابستہ ہیں۔ یعنی ان کی ولادت و وفات، ان کی صحت و فراست۔ انکی حصولِ علم کے لیے تگ و دو، ان کا حفظ و ضبط، ان کا قابلِ اعتبار یا قابلِ جرح و نقد ہونا۔ غرض اسی قسم کی وہ ساری باتیں جن کا تعلق راویوں کے احوال کی چھان بین سے ہوتا ہے، پھر اس مفہوم میں وسعت پیدا کر کے وہ سارے امور اس سے ملحق کر دیئے گئے ہیں جن کا تعلق بڑے بڑے حوادث و واقعات سے ہوتا ہے۔ مثلاً مصائب و آفات کا ظہور خلفاء، وزراء کے حالات اور امورِ سلطنت کا بیان، نیز ملک کی زمامِ اقتدار کا مختلف ہاتھوں میں منتقل ہوتے رہنا۔ ان تمام مباحث کو تاریخ کے دائرے میں شامل کیا جاتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ فنِ تاریخ میں زمانے کے واقعات اور وقت کی حیثیت دونوں سے بحث کی جاتی ہے۔ اس کا موضوع "زمانہ و انسان" ہے۔ بالفاظِ دیگر اس میں زمانے کی معرفت، انسان کے احوال سے بحث کی جاتی ہے۔

آغاز تاریخ و تقویم:۔

جہاں تک آغاز تاریخ کا اور تعیّنِ سنین کا تعلق ہے۔ اس سلسلہ میں کہا جاتا ہے کہ

جب اولادِ آدمؑ پروان چڑھی اور کرۂ ارضی کی وسعتوں میں پھیل گئی تو انہوں نے پہلے پہل دِنوں اور برسوں کے شمار کے لیے تاریخ کا تعین "ہبوطِ آدم" سے کیا۔ پھر جب طوفانِ نوحؑ آیا تو اس طوفان سے تاریخ شمار ہونے لگی۔ پھر ابراہیمؑ اور آتشِ نمرود کے حوالے سے تاریخ و تقویم متعین ہونے لگی۔ مابعد حضرت یوسفؑ کے سریر آرائے سلطنت ہونے سے، بعد ازاں حضرت موسیٰؑ کے سرزمین مصر سے خروج کے وقت سے، نیز حضرت داؤدؑ حضرت سلیمانؑ کی سلطنت سے تا آنکہ حضرت عیسیٰؑ کے زمانے تک اسی طریقۂ "تاریخ" (تقویم) کا رواج جاری رہا۔ بالآخر حضرت عیسیٰؑ کی وفات سے عرصہ بعد عیسوی تقویم کا رواج ہوا

عہدِ اسلام میں مبدأ تاریخ :۔

اس باب میں مشہور ترین روایت تو یہ ہے کہ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ جناب عمر فاروقؓ کے نام ایک مکتوب میں عرض کیا کہ آپ کی جانب سے ہمارے پاس فرامین اور سرکاری مراسلات آتے ہیں مگر ان پر تاریخ اجراء درج نہیں ہوتی۔ تب امیر المومنین نے صائب الرائے لوگوں کو جمع کر کے مشورہ کیا۔ بعض اصحابِ شوریٰ نے تجویز پیش کی کہ بعثتِ نبویؐ کو مبدأ تاریخ مقرر ہونا چاہیے۔ بعض نے ہجرتِ نبویؐ کی بابت رائے دی۔ مشورے کے بعد فاروقِ اعظمؓ نے طے فرمایا کہ ہجرت حق و باطل کے درمیان فارق (حدِ فاصل) کی حیثیت رکھتی ہے لہٰذا اسی اہم واقعے کو اسلامی تاریخ و تقویم کا نقطۂ آغاز قرار دیا جائے۔ جب مجلسِ شوریٰ کا اس تاریخی فیصلے پر کلّی اتفاق ہو گیا تو دوسرا سوال اسلامی سال کے پہلے مہینے کے تعین کے بارے میں زیرِ بحث آیا چنانچہ بعض اصحابِ رسولؐ نے عرض کیا کہ اسلامی تقویم کی ابتداء رمضان کے مقدس و بابرکت مہینے سے کی جائے۔ لیکن جناب فاروقِ اعظمؓ نے طے فرمایا کہ اسلامی سال کی ابتداء ماہ محرم سے کی جائے کیونکہ مسلمانوں کے ایامِ حج سے فارغ ہو کر لوٹنے (اور زندگی کا نیا باب شروع کرنے) کا زمانہ یہی ہے۔

اس طرح ۱۷ھ مسلمانوں میں، ہجری سن و تقویم کا رواج ہوا۔

تاریخ نگاری کی ابتداء :۔

جہاں تک تاریخ کے موضوع کے جزوِ ثانی یعنی احوالِ انسانی کے جمع اور محفوظ کرنے کا

تعلق ہے تو اس بارے میں صورتِ احوال یہ ہے کہ ابتدائی ادوارِ تاریخ میں انبیاؑ، عُلماء فضلاء حکماء، اور ملوک و اُمراء کے سوانح حیات کی باقاعدہ تدوین نہ ہو سکی بلکہ اہم تاریخی واقعات وحقائق کی چند جھلکیاں منتشر و مبہم روایات کی صورت میں (سینہ بہ سینہ) اسلاف سے اخلاف تک پہنچتی رہیں اور ان کو محفوظ کرنے کا کوئی خاطر خواہ انتظام نہ ہو سکا یہ صورت حال صدیوں تک چلتی رہی۔ البتہ خال خال حکمرانوں نے سکوں، پتھروں اور تانبے کی تختیوں پر چند معروف واقعات کو اجمالاً کندہ کروایا۔ بعد ازاں ان قوموں کے ہاں کہ جنہوں نے تمدن کا کچھ حصہ پایا تاریخی اقوال و کوائف تحریری صورت میں مرتب و مدوّن ہونے لگے۔ مثلاً فارس، روم، ہند اور چین کی اقوام وغیرہم۔ گو مورخینِ اسلام نے ان قدیم اقوام کے جمع کردہ تاریخی واقعات بکثرت اپنی تصنیفات میں (بحالتِ مجبوری) نقل کیے ہیں مگر ان پر کلی اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ دراصل یہ احوال و واقعات اس لیے ناقابلِ یقین ہیں کہ ان کے راویوں اور ابتدائی مولفین نے نہ تو سند (ذریعہ اطلاع) کی تصریح کی ہے نہ ان مولفین کے ثقہ و قابلِ اعتماد ہونے کا ہمیں بخوبی علم ہے اور نہ ان کے اخلاق و کردار کے کوائف مصدقہ طور پر ہم تک پہنچے ہیں کہ پورا اطمینان کیا جا سکے کہ انہوں نے اپنی تالیفات میں جو کچھ نقل و درج کیا ہے وہ کہاں تک درست ہے۔

بعض انصاف پسند جدید مغربی مصنفین نے قدیم مغربی اقوام کی تاریخ کے چند در چند گوشوں کے پردۂ تاریکی میں ہونے کا از خود اعتراف کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی قدیم تاریخ کی چھان بین میں لگے ہوئے ہیں۔ ان کی تاریخ کے دامن میں جو جھوٹے قصے بے سروپا حکایتیں موجود ہیں ان کو صحیح تاریخی واقعات سے چھانٹ چھانٹ کر الگ کیا جا رہا ہے تاہم یہ محققین اپنے مستحسن مقاصد میں پوری طرح کامیاب نہیں ہو سکتے کیونکہ ان کے پاس کوئی ایسا یقینی ذریعۂ معلومات موجود نہیں۔ جن سے پیشرو مؤرخین اور راویوں کی ثقاہت و عدالت اور فہم و فراست کا اُنہیں اتہ پتہ مل سکے۔ البتہ اسلامی ادوار میں فنِ تاریخ نگاری کی تمام ضروری شرائط ملحوظِ خاطر رکھی گئی ہیں۔ ہمیں فخر ہے کہ مؤرخینِ اسلام نے صدیوں پہلے اس محققانہ روش کو اپنایا۔ جسے آج بعض مغربی مصنفین اختیار کیے ہوئے ہیں۔ بلاشبہ مسلم مؤرخین صدیوں قبل (اس میزان کے ذریعہ جو علمائے حدیث کے ہاں "علم اصولِ حدیث" کے نام سے موسوم ہے) واقعات و

روایات کی صحت وسقم اور صدق وکذب کی کماحقہ معرفت پر قادر ہو سکے اور تاریخ نگاری کے فن کو معراجِ کمال تک پہنچا دیا۔

تاریخ نگاری کی ابتداء:۔

جہاں تک اسلام میں تاریخ نگاری کے سلسلۂ آغاز کا تعلق ہے اسکی ابتدائی نوعیت یہ تھی کہ صحابۂ کبار رضؓ حضور اکرمؐ کے غزوات وسرایا کی تفاصیل کو سینوں میں رکھنے کا بڑا اہتمام فرماتے تھے اور اپنی آل واولاد کو بھی ان واقعات کو یاد رکھنے کی تاکید کرتے رہتے۔ نیز حضرات صحابۂ کرام اور ان کی اولاد کو خلفائے راشدین کے زمانے کی فتوحات کی جزئیات تک کو یاد رکھنے کا پورا دھیان تھا۔ پھر تابعین عظام بھی صحابۂ کرامؓ کے نقشِ قدم پر چلے۔ یہاں تک کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے فرمان سے حدیثیں مدوّن ہونے لگیں اور یہ سعادت جن باسعادت اصحاب کے حصّہ میں آئی تو انھوں نے کذب وافتراء کا سدِّ باب ضروری سمجھا۔ لہٰذا انھوں نے راویوں کے احوال کی چھان بین شروع کی۔ ان کی ثقاہت وعدالت حفظ وضبط اور اخلاق وکردار کی تحقیق و پڑتال میں لگ گئے۔ چنانچہ تقریباً ڈیڑھ لاکھ راویوں کے اسمائے گرامی، جائے ولادت، مقامِ وفات اور ان کے سارے ضروری کوائف کا عظیم الشان ذخیرہ فراہم ہوگیا۔

اس کے بعد ان راویوں میں سے جن ارباب علم وفضل نے فنِ تاریخ میں تالیفات سپردِ قلم کیں تو صرف ان کے حفظ وضبط اور فضل وکمال کو جانچنے اور جاننے پر اکتفا کیا گیا۔[1] چنانچہ ان مؤلفین میں سے جو ثقاہت وعدالت سے متصف اور حفظ وضبط کے خصائص سے بہرہ مند تھے ان کی تالیفات مقبول ومعروف ہوئیں اور ان کے مشمولات اہلِ نظر کے اعتماد کے مستحق قرار پاتے۔ مثلاً ابن الاثیر۔ یاقوت رومی، ذہبی، ابن کثیر، ابن حجر عسقلانی، بدرالدین عینی اور ابن خلدون وغیرہ! اس کے برعکس جس مورخ یا مؤلف کی بابت عدم عدالت یا سوءِ حفظ، یا مطلوبہ قوتِ تحقیق وتنقید کے فقدان کا گمان ہوا تو اس کی تاریخ قبول تام کا شرف حاصل نہ کر سکی اور اس کے معاصرین یا مابعد کے ناقدین نے اُس کے سوءِ فہم، ضعفِ رائے سے اپنے قارئین کو پوری طرح مطلع وباخبر کردیا۔

---

[1] یعنی علمِ تاریخ میں علمِ حدیث کی نسبت راویوں کے بارے میں معیار قدرے نرم کردیا گیا۔

کتبِ تاریخ کی کثرت :۔

مسلمانوں نے ایسی کتب بکثرت تحریر کی ہیں جو چہار دانگِ عالم کے بہت سے ممالک کی سرگذشتوں اور تاریخوں پر مشتمل ہیں۔ یہاں تک کہ انہوں نے عظیم شخصیات اور اہم واقعات کی تمام ضروری تفاصیل مرتّب و مہیّا کر دی ہیں تاریخی کتابوں کی کثرت کا اندازہ اس امر سے کیا جا سکتا ہے کہ صاحب کشف الظنون (حاجی خلیفہ چلبی) کا یہ قول ہے کہ ہم نے (ایک کتب خانے میں) تیرہ سو تاریخی کتب شمار کی ہیں۔ حافظ سخاوی متوفی ۹۰۲ھ التوبیخ لمن ذم التاریخ میں لکھتے ہیں تاریخی کتابیں تعداد میں اتنی کثیر ہیں کہ ان کا شمار ہی ممکن نہیں اور ان کی کثرت کا اندازہ حافظ علاءالدین مغلطائی کے اس تاریخی جملے سے کیا جا سکتا ہے۔ ”میں نے صرف ایک ملک کے متعلق تقریباً ایک ہزار تاریخی تالیفات دیکھی ہیں“۔[1] نیز علامہ سخاوی فرماتے ہیں کہ میں نے حافظ ابوعبداللہ ذہبی کی خودنوشت تحریر دیکھی ہے۔ ”تاریخ کی اتنی انواع و اقسام ہیں کہ اگر میں ان سب کو بیان کرتا تو میری کتاب چھ سو جلدوں سے کم میں ختم نہ ہوتی مگر میں نے سب اقسام کا احاطہ نہیں کیا“۔[2] پس یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ مسلمانوں نے تاریخ نویسی کے فن کا حق ادا کر دیا ہے اور اس شعبۂ علم میں تحقیق و تنقید کا کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ مگر افسوس ہے کہ اردو زبان میں آج تک میری نگاہ سے کوئی ایسی کتاب نہیں گذری جس میں مورخین کے سیر و سوانح، ان کے احوال و کوائف اور ان کے علمی مقام و مرتبے پر سیر حاصل تبصرہ اور نقد و جرح کی گئی ہو۔ ایسے میں رفیقِ محترم پروفیسر سعید اختر صاحب نے اس کارِ خیر کا بیڑہ اُٹھایا کہ علم کے اُس شعبے میں دادِ تحقیق دی جائے جو ہنوز تاریکی میں گم رہا ہے تاکہ مسلمان اپنے اسلاف (خصوصاً مشاہیر مؤرخین) کی بیش بہا علمی کاوشوں سے بہرہ ور ہو سکیں اور اُنہیں اندازہ ہو سکے کہ ہمارے اکابرین میں کس درجہ کے اصحاب علم و فضل پیدا ہوئے ہیں اور انہوں نے کیسے کیسے رفیع علمی و نظری کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں۔؟

میرے خیال میں پروفیسر موصوف اس عظیم کام کی انجام دہی میں خاصے کامیاب رہے ہیں۔

---

[1] اصلاح ابن الصلاح ۔ مولفہ حافظ علاءالدین مغلطائی

[2] التوبیخ لمن ذم التاریخ ۔ مولفہ حافظ سخاوی

اور انہوں نے علم کے ایک تاریک گوشے کو ہمارے اردو خواں حضرات کے سامنے بطریقِ احسن بے نقاب کر دیا ہے۔ مجھے توقع ہے کہ پروفیسر صاحب کی علمی کاوش اور مبارک سعی و جُہد مشکور و مقبول ہوگی اور اصحابِ علم و فضل بڑے ذوق و شوق کے ساتھ اس عالی قدر تالیف کا مطالعہ فرمائیں گے اور ان کی تحقیق و علمی خدمات کو سراہیں گے۔ امید کی جاتی ہے کہ ایم اے تاریخ کے اساتذہ و طلبا بھی، جن کے نصاب میں مسلمانوں کی تاریخ نویسی کے سرمایۂ علمی (MUSLIM HISTIRIOGRAPHY) کا تنقیدی مطالعہ شامل ہے اس گراں مایۂ تالیف سے بھرپور استفادہ کرکے فاضل مؤلف کو خراجِ تحسین پیش کریں گے۔

پروفیسر غلام احمد حریری

اسلامی یونیورسٹی، بہاولپور،

از پروفیسر سعید اختر

ابتدائیہ

حضور سرور کائنات صلعم کی سیرتِ طیبہ کے مختلف پہلوؤں کو محفوظ کرنے کے لیے عربوں میں سیرت نگاری کا فن معرضِ وجود میں آیا اور غزوات و سرایا کی تفصیل قلم بند کرنے کے لیے علمِ مغازی کی ابتدا ہوئی۔ یہی علم سیر و مغازی فنِ تاریخ نگاری کا ابتدائی زینہ ثابت ہُوا۔ سیرت و مغازیٔ رسولؐ کے موضوع پر سب سے پہلے دوسری صدی ہجری میں محمد بن اسحاق نے "السیرۃ والمبتدا والمغازی" تالیف فرمائی۔ جس سے بعد کے سیرت نگاروں اور مؤرخوں نے بھرپور فائدہ اُٹھایا۔ تاہم سیرت نگاری کے میدان میں سب سے زیادہ ابنِ ہشام نے شہرت حاصل کی۔ جنہوں نے ابن اسحاق کی تالیف کی اتنی دیانت اور محنت سے تہذیب و اصلاح فرمائی کہ لوگ اصل نسخے سے بے نیاز ہو گئے۔ اسی زمانے میں اصمعی نے فتوح السلاطین میں عربوں کی معاشرتی و تہذیبی زندگی کو محفوظ کر دیا۔ الواقدی نے صدرِ اسلام کی تاریخ اور پیغمبرِ اسلامؐ کے مغازی سے متعلق بڑا تحقیقی ذخیرۂ معلومات اپنی متعدد تالیفات خصوصاً کتاب المغازی میں جمع کر دیا۔ ابن سعد نے صحابہؓ اور تابعینؒ کے حالاتِ زندگی پر طبقات ابنِ سعد جیسی ضخیم کتاب لکھ کر سیرت نگاری کے دائرے کو وسعت بخشی۔

مسلمان مؤرخین نے تیسری صدی ہجری میں علم سیرت و مغازی سے اپنا قدم فنِ تاریخ نویسی کی طرف بڑھایا۔ جس کا ابتدا سے ہی رجحان عالمی و آفاقی تھا۔ ابو حنیفہ دینوری نے عربوں کے علاوہ ایرانیوں کی تاریخ سپردِ قلم کی۔ ابنِ قتیبہ نے اس پہلو پر خصوصی توجہ دی کہ زمامِ اقتدار ایک حکمران سے دوسرے فرمانروا کی جانب اور ایک خانوادے سے دوسرے خانوادے کی طرف کیونکر منتقل ہوتی ہے؟ البلاذری نے نہ صرف عربوں کے معرکوں اور فتوحات کی ایمان افروز روداد قلم بند کی بلکہ تہذیبی، عمرانی اور معاشی مسائل پر قلم اُٹھا کر تاریخ کے دائرے کو وسیع سے وسیع تر کر دیا۔ ابن الواضح یعقوبی نے حضرت آدمؑ سے لے کر حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم تک اور آنحضورؐ کے بابرکت دور سے لے کر خلیفہ المعتمد کے زمانے تک کتاب "التاریخ الکبیر" کے نام سے مفصل تاریخِ اسلام قلم بند کی۔ امام محمد بن جریر طبری نے تاریخ نگاری میں محدثین کا سا اندازِ تحقیق اختیار کر کے اور ہر واقعہ کی اسناد کے سلسلوں کو متعین کر کے اسلامی تاریخ نگاری کو ابتدائی دَور میں ہی علمی و فنی رفعتوں سے ہمکنار کیا۔

چوتھی صدی ہجری، تاریخ نگاری کے عنفوانِ شباب کا عہد ہے۔ اس دور میں ہمیں دو مؤرخ بڑے ممتاز نظر آتے ہیں۔ ایک المسعودی اور دوسرے ابن مسکویہ! المسعودی نے حکمران خاندانوں کی ترتیب کے لحاظ سے اخبارالزمان لکھی جس میں مضامین کا تنوع بھی ملتا ہے اور فلسفیانہ بصیرت کی جھلک بھی دکھائی دیتی ہے۔ مزید برآں علامہ المسعودی نے فنِ تاریخ اور علمِ جغرافیہ کو باہم دگر مربوط کر دیا۔

ابنِ مسکویہ نے (اپنی فلسفیانہ تالیف "تجارب الامم" میں) ایک طرف جنگی تدبیروں، حکومت کے نظم و نسق اور سلطنت کے محاصل و مصارف پر فاضلانہ مباحث قلم بند کیے اور دوسری طرف اپنی حریّتِ فکر اور فلسفیانہ ژرف نگہی سے فنِ تاریخ کو چار چاند لگا دیئے۔ تاریخ نگاری میں تنقیدی بصیرت اور فلسفیانہ درک اس دَور کے مؤرخین کی اہم ترین خصوصیّت ہے۔

پانچویں صدی ہجری میں جن لوگوں نے علمِ تاریخ پر قلم اُٹھایا وہ اپنے دور کے نامور محدّث بھی تھے اور جیّد علماء بھی، مثلاً خطیب بغدادی اور ابن عساکر! ان ہر دو مؤرخین نے ان مشہور شہروں (دارالسلطنتوں) کی تاریخ لکھی جو اس زمانے کی ملکی سیاست میں بڑا اہم کردار ادا کر رہے تھے۔ خطیب بغدادی نے بغداد (عروس البلاد) کی تاریخ بیس[۲] جلدوں میں قلم بند فرمائی جس میں عباسی دارالحکومت کے محلّوں، دفتروں، مسجدوں اور سرکاری عمارتوں کا مفصّل تذکرہ ہے۔ دوسری طرف بغداد کے مشاہیر، مثلاً اُمراء، خلفاء، عُلماء، اور محدّثین کرام کے سوانح حیات کا بیان ہے۔ خطیب بغدادی کے اسلوب پر ابنِ عساکر نے دمشق کی تاریخ مرتب فرمائی اور اسّی جلدوں میں اموی دارالسلطنت (دمشق) کے مصنفین اور محققین کے حالات بڑی شرح و بسط سے بیان فرمائے اور یہ ثابت کر دیا کہ دمشق دوبارہ بساطِ سیاست پر اُبھر رہا ہے اور اپنی عظمتِ رفتہ کی متاعِ گراں بہا کی بازیافت کر چکا ہے۔ بظاہر یہ ہر دو تالیفات دو دارالسلطنتوں کے احوال و کوائف پر مشتمل ہیں۔ اگر ان کے مباحث کا بنظرِ غائر مطالعہ کیا جائے تو ہمارے سامنے اس دور کی معاشرتی، تمدنی، تہذیبی اور معاشی زندگی کا پورا نقشہ آجاتا ہے اور مستشرقین کے اس بے بنیاد الزام کی بے وقعتی ظاہر ہو جاتی ہے کہ مسلمان مؤرخین نے محض بادشاہوں کے حالات قلم بند کیے ہیں اور عمرانی و تہذیبی مباحث پر پوری توجہ نہیں دی ہے۔

چھٹی صدی ہجری کے مؤرخوں میں ابن جوزی اور ابن اثیر کے نام سرفہرست ہیں دونوں اکابر اپنے وقت کے متبحّر عالم اور نامور محدث تھے۔ ابن جوزی نے المنتظم کو تاریخ اور سوانح کا انوکھا اور اچھوتا بنا دیا۔ انہوں نے علمائے دین اور محدثین کے حالات پر خصوصی توجہ فرمانے کے دوش بدوش مختلف ادوار

کی علمی، سیاسی، معاشرتی، تمدنی اور تہذیبی حالت کا واضح و جامع نقشہ کھینچ دیا۔ ابن اثیر نے بھی "الکامل فی التاریخ" میں عالمِ اسلام کی ابتدائی چھ صدیوں کے حالات بڑے اختصار اور بڑی جامعیت سے پیش کر دیئے۔ اور حقائق اور واقعات کی تہذیب و تنقیح میں غیر معمولی کد و کاوش کا ثبوت دیا۔

ساتویں صدی ہجری کے مؤرخین نے تذکرہ نویسی کے میدان میں (جو علمِ تاریخ کی اہم شاخ ہے) اپنے جوہر دکھائے۔ جن میں سے یاقوت حموی اور قاضی ابن خلکان دونوں کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ یاقوت حموی نے کوفہ، بصرہ، خراسان، حجاز، یمن، مصر، شام، الغرض تمام ممالکِ اسلامیہ کے ادیبوں، شاعروں، نسّابوں، مؤرخوں، مصنفوں اور عالموں کے مختصر سوانح جات قلم بند کیے۔ تقریباً پچاس برس بعد قاضی ابنِ خلکان نے اپنی شہرۂ آفاق تالیف "وفیات الاعیان" ترتیب دی۔ جس میں انہوں نے نہ صرف سلاطین، وزراء، علماء، فقہا، اُدبا، شعراء غرضیکہ ہر طبقۂ کمال کے ممتاز افراد کے حالات مرتب کیے بلکہ مختلف مذہبی، کلامی، سیاسی، علمی، فکری، تحریکوں کے بارے میں بیش قیمت سرمایہ علم فراہم کر دیا۔ ایسے تذکروں کی تاریخی قدر و قیمت کے بارے میں استاذ محترم ڈاکٹر عنایت اللہ صاحب لکھتے ہیں۔

> "خلفاء اور وزرا کو چھوڑ کر دوسرے مشاہیر کے سوانح حیات بھی اس لحاظ سے تاریخی اہمیت رکھتے ہیں کہ ان سے قدیم زمانے کی علمی و تعلیمی حالت کے علاوہ عام تمدن و معاشرت پر بھی قابلِ قدر روشنی پڑتی ہے اور دراصل یہی وہ چیزیں ہیں جو فنِ تاریخ کی جان ہیں۔ خوش قسمتی سے عربی زبان میں ہر قسم کے مشاہیر پر بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں جن کی مدد سے عام تاریخوں کے سادہ خاکے میں بہت کچھ رنگ بھرا جا سکتا ہے۔"

آٹھویں صدی ہجری میں ابو الفدا اور علامہ ذہبی اور ابنِ کثیر جیسے جلیل القدر مؤرخ پیدا ہوئے جنہوں نے ایک طرف اقوام قدیمہ کے مختصر تاریخی حالات کے بیان کے بعد، ظہور اسلام سے لے کر تقریباً سات صدیوں کے سیاسی و تمدنی حالات سنین وار درج کیے اور عمومی تواریخ لکھیں۔ اور دوسری طرف انہوں نے روایات کی جانچ پڑتال میں غیر معمولی مؤرخانہ کاوش و مہارت کا ثبوت دیا۔ خصوصاً علامہ ابنِ کثیر نے فنِ درایت کو فنِ تاریخ نویسی کی بنیاد بنایا اور تاریخی روایات کی تہذیب و تنقیح کا حق ادا کر دیا اور ایسی متعدد معروف لیکن ضعیف روایات کو مسترد کر دیا جو مسلمانوں کے سرمایۂ تاریخ میں شامل ہو کر ذہنوں کو پراگندہ کر رہی تھیں۔ اس دور کو تاریخی روایات کی تہذیب، تنقیح اور تحقیق کا زریں دور قرار دیا جاسکتا ہے۔

اسی آٹھویں صدی کے عظیم ترین مورخ علامہ ابن خلدون ہیں۔ جنہوں نے کتاب العبر کی پہلی جلد (مقدمہ ابن خلدون) میں عمرانیات، اجتماعیات، اقتصادیات اور سیاسیات کے متنوع عنوانات پر خیال افروز بحثیں کرکے تاریخ کے موضوع کو بے پایاں وسعت عطا فرمائی اور تاریخی حقائق و مباحث پر فلسفیانہ بحثیں کرکے عمرانیات اور فلسفۂ تاریخ جیسے جدید فنون کی طرح ڈالی۔ المقریزی نے مقدمہ ابن خلدون کے بارے میں سچ کہا تھا کہ ایسی کتاب آج تک نہیں لکھی گئی۔ اور یہ امر مشکل ہے کہ کوئی شخص باوجود کوشش کے اس کے درجہ تک پہنچ سکے

لَمْ یُعْمَلْ مِثَالُهَا وَ اِنَّهُ لَعَزِیْزٌ اَنْ
یَنَالَ مُجْتَهِدٌ مِثَالَهَا۔

نویں صدی ہجری میں مصر اور شام کے ملکوں میں بہت سے جلیل القدر اور عظیم المرتبت مورخ پیدا ہوئے۔ جنہوں نے تاریخ کے فوائد و نقائص پر مفصل بحثیں کیں تاکہ اہل علم کی توجہ اس گراں قدر علم سے نہ ہٹنے پائے۔ مثلاً علامہ مقریزی اور علامہ سخاوی وغیرہ۔ اوّل الذکر محقق کی تین تالیفات کو سامنے رکھا جائے تو حضرت آدم سے لے کر دولتِ عباسیہ تک تمام اسلامی ممالک کی تاریخ سامنے آجاتی ہے بلکہ بعد کے ادوار مثلاً ایوبی خاندان اور مملوک خاندانوں کے احوال پر بھی ان کی تالیفات اپنی مثال آپ ہیں۔ ثانی الذکر مورخ علامہ سخاوی نے علمِ تاریخ کی چالیس انواع پر سیر حاصل بحث فرمائی۔ مثلاً پیغمبروں، وزیروں کاتبوں، قاریوں، محدثوں، مؤرخوں، نحویوں، ادیبوں، شاعروں اور طبیبوں کی تاریخ مرتب کی۔ ان جملہ انواعِ تاریخ پر دستیاب کثیر تالیفات کی فہرست کو دیکھ کر بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ علامہ ممدوح کے دور تک تاریخ نویسی کے میدان میں کتنی ترقی ہوچکی تھی۔

دسویں صدی کے سب سے نمایاں مورخ جلال الدین سیوطی ہیں جو حسنِ ترتیب اور حسنِ تبویب میں اپنے پیشرو مؤرخین پر سبقت لے گئے۔ یہ تو تھے مشرقی بلادِ اسلامیہ کے مؤرخین!

اب ایک طائرانہ نظر اندلس کے مسلمان مؤرخین پر بھی ڈال لی جائے جن میں ابن صاعد اندلسی اور لسان الدین بن خطیب زیادہ نامور ہوئے۔ ابن صاعد اندلسی کی طبقات الامم آٹھ متمدن اقوام کے مذاہب زبانوں، علوم اور ادبیات کی دائرۃ المعارف ہے جسے تالیف کرنے میں انہیں مشرق و مغرب کے تمام مصنفین و محققین پر شرفِ تقدم حاصل ہے۔ اندلس کے دوسرے نامور مورخ لسان الدین بن خطیب

ہیں جنہوں نے نہ صرف اندلس کے علماء، فضلاء، قضاۃ، شعراء، فقہاء، محدثین، مصنفین، محققین کے سوانح حیات قلم بند کیے ہیں بلکہ غرناطہ کی تہذیب، ثقافت، معاشرت اور اخلاقی حالت کا بڑے دلکش پیرائے میں نقشہ کھینچ دیا ہے۔ مزید برآں مسلمانوں کے عروج و زوال کے اسباب پر فاضلانہ بحثیں قلم بند کرکے انہیں مستقبل کے نتائج و عواقب سے آگاہ فرمایا ہے۔

فن تاریخ نویسی کے نشوو ارتقاء کے اس صدی وار جائزے کے بعد ہم پہلی دس صدیوں کے تینتیس ۳۳ نامور مورخین کے سوانح حیات اور علمی کمالات پر روشنی ڈالیں گے۔ یہاں اس امر کی طرف اشارہ کردینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ:۔

اسلام کی ابتدائی تاریخ "سیرت و مغازی سے عبارت ہے۔ صحابہ و تابعین دونوں طبقوں میں اس فن کے علماء موجود تھے۔ تابعین کرام میں سے عروہ بن زبیر، وہب بن منبہ، عکرمہ مولی ابن عباس، عاصم بن عمرو بن قتادہ، امام زہری، موسیٰ بن عقبیٰ، معمر بن راشد اس فن کے مسلم الثبوت امام تھے[۱] اس فن میں صاحب کشف الظنون کی تحقیق کے مطابق عروہ بن زبیر نے پہلی تالیف قلم بند کی۔ جبکہ امام سہیلی کا خیال ہے کہ امام زہری سیرت و مغازی کے فن کے پہلے مؤلف تھے۔

"سیرت و مغازی" کے فن کا دائرہ بتدریج وسیع ہوا اور بنوامیہ کے دور میں ملوک و سلاطین پر کتابیں لکھی جانے لگیں۔ مثلاً وہب بن منبہ نے سلاطینِ حمیر کے بارے میں کتابیں لکھیں۔ عبید بن شربہ نے "کتاب الملوک واخبار الماضیین" سپرد قلم کی اور عوانہ بن حکم نے کتاب التاریخ اور سیرتِ معاویہ" کے موضوع پر دو تالیفات مرتب کیں[۲]۔ لیکن بدقسمتی سے اموی دور کا سارا سرمایۂ تاریخ ناپید ہے۔ محمد ابن اسحاق وہ عظیم المرتبت مورخ ہیں جنہوں نے اموی دور میں نشوو نما پائی اور سیرت و مغازی کے موضوع پر پہلی معرکۃ الآراء کتاب (کتاب السیر والمغازی) اور بقول خطیب بغدادی اس فن کو اتنی ترقی دی کہ کوئی اس پر اضافہ نہ کرسکا[۳]۔ اگرچہ محمد ابن اسحاق کی کتاب السیر والمغازی اپنی اصل صورت میں ابوالحسن ماوردی کے عہد تک محفوظ رہی لیکن بعد میں یہ کتاب معدوم ہوگئی۔ علامہ طبری نے اس کتاب کے جامع اقتباسات نقل کرکے، اور ابن ہشام نے اس کتاب کی تلخیص کرکے اس کتاب کے ضروری مباحث کو حیاتِ دوام بخش دی۔

---

[۱] الفہرست ابن ندیم
[۲] الفہرست ابن ندیم [۳] تاریخ خطیب بغدادی

محمدابنِ اسحاق

علمِ مغازی و سیر کا متبحّر عالم ہونے کے لحاظ سے ابو عبداللہ محمد بن اسحاق ممتاز تابعین میں شمار ہوتے ہیں۔ آپ یسار کے پوتے تھے جو ۱۲ھ میں عراق میں عین التمر کے گرجا میں قید کر دیئے گئے تھے اور مدینہ میں آکر قبیلہ عبداللہ بن قیس کے آزاد کردہ غلام بن گئے تھے۔ محمد ابنِ اسحاق ۸۵ھ میں پیدا ہُوئے۔ انہیں ابتدا سے ہی بہت اچھی تربیّت ملی۔ جس کا فیضان تھا کہ عالمِ شباب کو پہنچتے ہی انہوں نے رسولِ کریم ؐ کی حیاتِ مبارکہ کو مرتب کرنے خصوصاً غزوات کے کوائف جمع کرنے پر اپنی ساری توجہ مرکوز کر دی۔ لیکن بدقسمتی سے ان کی مدینہ طیبّہ کے مقتدر محدثین سے مخالفت ٹھن گئی۔ چنانچہ انہیں اپنے وطن کو خیرباد کہنا پڑا۔ پہلے وُہ مصر تشریف لے گئے اور وہاں کے علماء سے ملاقاتیں کیں۔ بعد ازاں کوفہ آئے پھر جزیرہ (شمالی عراق) میں پہنچے۔ عراق عجم کا مشہور شہر رَے دیکھا۔ آخر بغداد میں مقیم ہو گئے۔ جہاں خلیفہ عباسی المنصور نے آپ کا احترام ملحوظ رکھا۔ علاّمہ موصوف نے بغداد ہی میں ۱۵۰ھ میں وفات پائی۔

ابنِ اسحاق علم کا ناپیدا کنار سمندر تھے۔ جب کسی فن میں کلام شروع کرتے تو اُسی مجلس میں تمام پہلوؤں کو زیرِ بحث لے آتے اور موضوع کا حق ادا کر دیتے۔ چنانچہ علاّمہ خطیب بغدادی لکھتے ہیں ”کہ ابنِ اسحاق سیر و مغازی کے جیّد عالم تھے۔ تاریخ عالم سے باخبر تھے۔ انبیاء کرام کے قصص سے آگاہ تھے۔ ان سے ممتاز آئمہ علم نے روایت کی ہے۔“

تاہم جس فن میں محمد ابن اسحاق کو اختصاصی کمال حاصل تھا وہ سیر و مغازی کا شعبۂ علم ہے۔ فہرست ابنِ ندیم سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے اس فن میں تین کتابیں لکھی تھیں۔ کتاب السیر والمغازی، کتاب السیرۃ والمبتداء اور کتاب الخلفاء۔ پہلی دو تصانیف سیرتِ رسولؐ کے موضوع پر تھیں اور تیسری خلفاءِ اسلام کے حالات کے بیان میں تھی۔ مرورِ ایّام سے یہ تینوں کتابیں ناپید ہو گئیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ علاّمہ ابوالحسن ماوردی کے پاس کتاب السیر والمغازی اپنی اصلی صورت میں موجود تھی۔ کیونکہ وُہ

احکام السلطانیہ میں "کتاب المغازی" کے جو قصے بیان کرتے ہیں وہ ابنِ ہشام کی کتاب میں صرف مختصر صورت میں موجود ہیں۔ کتاب "السیر والمغازی" کی طویل عبارتیں ایک طرف علامہ طبری نے اپنی کتاب الرسل والملوک میں نقل کی ہیں۔ اس لیے یہ کتاب (کسی نہ کسی حد تک) وہاں محفوظ ہے۔ مزید برآں ابنِ ہشام نے ابنِ اسحاق کے ایک خاص شاگرد زیاد بن عبداللہ البکائی الکوفی کے واسطے سے، ابنِ اسحاق کی سینکڑوں روایات نقل کر کے "سیر والمغازی" کی بازیافت کی ایک نئی صورت پیدا کر دی ہے۔ تاریخ خطیب بغدادی کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ ابنِ اسحاق نے غالباً اپنی محققانہ تالیف "السیرو المغازی" خلیفہ عباسی المنصور کی فرمائش پر اس کے بیٹے مہدی کی دل بستگی اور رہ نمائی کے لیے مرتب کی تھی اور اس کتاب کی اثر آفرینی کا عالم دیکھیے کہ وُہ خلفاء جنہیں ادب کے دُوسرے شعبوں سے تعلق خاطر تھا۔ اس گراں قدر تالیف کی بدولت "سیرت والمغازی" کے مباحث میں دل چسپی لینے لگے۔ سچ فرمایا ابنِ عدی نے کہ اگر محمد بن اسحاق کے لیے کوئی اور شرف کا پہلو نہ ہوتا تو یہی فضل و کمال ان کے لیے کافی ہے کہ انہوں نے بادشاہوں کو آنحضرتؐ کے سوانح اور مغازی کی طرف متوجہ کر کے انہیں بے کار کتابوں سے منحرف کر دیا۔ اسی عالمانہ تالیف کی بدولت ابنِ اسحاق کو اکثر فضلائے کاملین نے سیرت و مغازی کے فن کا امام قرار دیا ہے۔ چنانچہ حضرت امام زہری فرماتے ہیں کہ محمد ابنِ اسحاق مغازی کے علم کے سب سے بڑے عالم ہیں۔ اور حضرت امام شافعی کا قول ہے کہ جو شخص مغازی میں مہارت پیدا کرنا چاہے وہ محمد ابنِ اسحاق پر اعتماد کرے۔ ابن عماد حنبلی فرماتے ہیں کہ وہ علم کا سمندر تھے۔ نہایت ذکی، قوی الحافظہ، عالم اخبار (روایات) ماہر انساب اور علّامۂ دہر!

علمِ حدیث میں ابنِ اسحاق کے رتبے کے بارے میں محدثین میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ ایک طرف حضرت شعبہ اُنہیں "امیر المومنین فی الحدیث" کہتے ہیں۔ ابو معاویہ کہتے ہیں کہ ابن اسحاق قوی الحافظ ہیں یزید بن ہارون اُنہیں امیر المحدثین قرار دیتے ہیں۔ علی بن المدائینی انہیں ان بارہ افراد میں شمار کرتے ہیں جو حدیث میں حجّت ہیں۔ لیکن دوسری طرف امام مالک، عروہ بن مسعود، امام نسائی اور دار قطنی جیسے اکابر محدثین و فقہائے کبار اُنہیں فن حدیث میں قابل اعتبار نہیں سمجھتے۔ حافظ ذہبی نے ان اختلافی آراء کو سامنے رکھتے ہوئے یوں محاکمہ فرمایا ہے "محمد بن اسحاق علم کا ظرف تھے۔ مغازی و سیر کا نہایت وسیع علم رکھتے تھے۔ لیکن وہ ان باتوں میں یقینی حجّت کا درجہ نہیں رکھتے۔" آگے چل کر

علامہ ممدوح لکھتے ہیں :۔

"محمد ابن اسحاق حلال و حرام میں حجت نہیں۔ مگر وہ ایسے زیادہ کمزور بھی نہیں۔ اُن سے فی الجملہ سند لی جا سکتی ہے۔ عصرِ حاضر میں بھی ابن اسحاق کی کتاب سیرت والمغازی کو بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

ڈاکٹر عنایت اللہ لکھتے ہیں۔" ابن اسحاق کی تالیف سیرتِ نبوی کی سب سے اہم کتاب ہے اور اس فن میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے بعد کے مصنفین نے اس تالیف پر پورا اعتماد کیا ہے۔ چنانچہ طبری اور دوسرے مؤرخین نے بھی ابن اسحاق سے بکثرت روایت کی ہے۔ ابن خلدون نے اپنی تاریخ کے حصۂ سیرتِ رسول میں اس کا حوالہ دیا ہے۔

نیاز فتح پوری نگار کے "علم و علماء نمبر" میں لکھتے ہیں۔ کتاب المغازی سیرتِ رسولؐ کے موضوع پر اوّلین تصنیف مانی جاتی ہے۔ جس سے تمام مابعد کے مؤرخین نے استفادہ کیا ہے۔

ایم جی رسول اپنی تالیف "مسلمانوں میں فنِ تاریخ کا آغاز اور نشوونما" میں لکھتے ہیں کہ ابن اسحاق مغازی اور سیرت کے موضوع پر سب سے بڑی سند مانا جاتا ہے جس کی ہمسری کا دعویٰ کسی حد تک واقدی کر سکتا ہے۔

ابنِ ہشام

سیرت نگاری کے موضوع پر قدیم ترین تالیفات ہم تک پہنچی ہیں۔ ان میں سے ایک علامہ ابو محمد عبدالملک بن ہشام کی شہرہ آفاق کتاب "سیرت الرسول" ہے محققین و مؤرخین نے اسی تالیف کے سبب ابن ہشام کے سر پر شہرتِ عام اور بقائے دوام کا سہرا باندھا ہے اور ہر دور کے سیرت نگاروں اور مسلمانوں مؤرخوں نے اس لافانی تالیف سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔

محمد بن اسحاق امام زہری کے لائق ترین شاگردوں میں سے ایک تھے اور سیرت و مغازی کے فن کے امام تھے۔ ابن ہشام نے اپنے استاذِ محترم ابن اسحاق کی مبسوط تالیف "کتاب المغازی" کی مناسب تہذیب و اصلاح کر کے ایک نئی کتاب "سیرت الرسول" کے نام سے ترتیب دی اور جن اصولوں کو انہوں نے مشعلِ راہ بنایا وہ اس کتاب کی تمہید میں درج فرمائے۔

ابن ہشام نے ابن اسحاق کی روایات میں کہیں کہیں مناسب اضافے فرمائے۔ چنانچہ جہاں کہیں انہوں نے اضافے کیے اس کی تصریح کی۔ جہاں ابن اسحاق سے اختلاف کیا۔ وہاں اپنے موقف کی تائید میں ٹھوس دلائل دیئے۔ جو روایتیں آنحضرتؐ کی سیرتِ طیبہ سے قریبی مناسبت نہ رکھتی تھیں، انہیں اپنی تالیف سے خارج کر دیا۔ مشکل مقامات اور مبہم اصطلاحات کی تشریح و وضاحت فرمائی۔ غیر ضروری عربی اشعار قلم انداز کر دیئے۔ اس طرح قارئین کو سیرت ابن اسحاق میں جو کمی محسوس ہوتی تھی وہ کچھ اس خوش اسلوبی سے ابن ہشام نے پوری کر دی کہ لوگ اصل کتاب سے بے نیاز ہو گئے اور ابنِ ہشام کی شرح کو دوام حاصل ہو گیا۔

ابنِ اسحاق کا طرزِ نگارش ادق اور گنجلک تھا۔ ابن ہشام نے اس کے برعکس، شگفتہ، شستہ، سادہ اور واضح اسلوبِ بیان اختیار کیا۔ اس قابلِ قدر تصنیف کا ہر لفظ آنحضورؐ کی ذاتِ گرامی سے والہانہ وابستگی کا آئینہ دار ہے۔ مزید برآں مولف کی محنت، تحقیق و کاوش بھی ظاہر و باہر ہے۔

اگرچہ فاضل مؤلف نے ابن اسحاق کی نسبت اپنی کتاب "سیرت الرسولؐ" میں قرآنی آیات کم کر دی ہیں۔ لیکن پھر بھی وہ ایک ہزار سے کچھ زائد ہی ہیں۔ جن سے اس امر کی طرف واضح اشارہ ملتا ہے کہ سیرتِ نبوی کا سب سے مستند اور قابلِ اعتماد مآخذ خود قرآنِ مجید ہے۔ جو آنحضرتؐ کی سیرت، دعوت، پیغمبرانہ کمالات اور کارناموں سب کا جامع ہے۔ ابنِ ہشام نے اپنی کتاب کی تمہید میں آدمؑ سے لے کر محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک جملہ انبیاء علیہم السّلام کے حالات کا تذکرہ کر کے اس حقیقت کی طرف بلیغ اشارہ کر دیا ہے۔ کہ نبوت کا سلسلہ کہاں سے شروع ہو کر کہاں ختم ہو جاتا ہے۔ نیز یہ کہ اسلام کوئی نئی تحریک نہ تھی۔ جو وقتی حالات کی پیداوار ہو۔ بلکہ یہ خدائے قدّوس کا ازلی ابدی پیغام ہے، جسے مختلف تاریخی ادوار میں انبیاءؑ نے عالمِ انسانیت کی ہدایت و رہنمائی کے لیے پیش کیا۔ اس کتاب کا سب سے بڑا وصف حُسنِ ترتیب اور جامعیت ہے۔ آنحضرتؐ کی ولادت، رضاعت، طفولیت کے حالات، عنفوانِ شباب، حضرت خدیجہ سے نکاح، نبوت کے منصب پر سرفرازی، تحریک اسلامی کے مخالفین کا ردِّ عمل، ہجرتِ مدینہ، یہودیوں سے عہد نامہ اور سلسلۂ مؤاخات کا قیام، بدر، اُحد اور حنین و احزاب کے معرکے، بلکہ متعدد غیر معروف غزوات و سرایا کی تفاصیل، فتح مکہ، حضورؐ کی علالت و وفات۔ آنحضورؐ کی ازواجِ مطہرات کے سوانح، الغرض سیرتِ نبویؐ کا وہ کونسا پہلو ہے۔ جس پر فاضل مصنف نے قلم نہ اٹھایا ہو اور اس پر مستند و معتبر مواد نہ پیش کیا ہو!

یہ امر واقعہ ہے کہ سیرت ابن ہشام کی شہرت و مقبولیت دن بدن بڑھتی چلی جاتی ہے۔ چنانچہ فارسی زبان میں اس کا نہایت معیاری ترجمہ ابو بکر سعد زنگی نے کیا تھا۔ جو شیخ سعدی مرحوم کے ہم عصر تھے۔ اُردو زبان میں اس کے کئی ترجمے ہو چکے ہیں۔ جن میں مولوی محمد انشا خان، سید لٰیسین علی اور مولوی قطب الدین احمد محمودی کے تراجم کمیاب ہیں۔ حال میں عبد الجلیل صدیقی نے اس بیش قیمت کتاب کا ترجمہ شائع کیا ہے۔ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی نے اس کتاب کی عمدہ تلخیص مرتب کی ہے۔

فرانسیسی اور جرمن زبان میں بھی یہ عظیم تالیف ترجمہ ہو چکی ہے۔ انگریزی زبان میں اس کے کئی اعلیٰ ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔ الغرض سیرت نگاری کے موضوع پر یہ تالیف قدیم ترین، مکمل ترین اور مستند ترین سمجھی جاتی ہے۔ اور مقبول خاص و عام ہے۔

سیرت ابنِ ہشام کی غیر معمولی مقبولیّت اور معنوی عظمت کے پیشِ نظر اندلس کے مشہور محدث امام ابوالقاسم عبدالرحمان سہیلی نے ایک سو بیس کتب کی مدد سے اس تالیف کی شرح (۵۶۹ھ) میں مرتب فرمائی جس سے بعد کے تمام سیرت نگار خوشہ چینی کرتے رہے ہیں۔ ابن خلدون نے بھی جا بجا سہیلی کی شرح کا حوالہ دیا ہے۔

آخر میں ہم یہ بھی عرض کریں گے کہ سیرت ابنِ ہشام کا جدید اہلِ علم کی نظر میں مقام و مرتبہ کیا ہے۔ اس سلسلہ میں عبدالعزیز دوری نے اپنی تالیف "علم التاریخ عند العرب" میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ابنِ ہشام نے ابنِ اسحاق کی موضوع روایات اور جھوٹے اشعار قلم انداز کر کے محدثین کا سا اسلوبِ تحقیق و بیان اختیار کیا ہے۔

خدابخش مرحوم کی رائے میں مواد کی ترتیب، ناقدانہ بصیرت، مصادر کی جانچ پڑتال اور وقائع کی صحت و عدم صحت کا محاکمہ کرنے میں ابنِ ہشام اپنے پیش رَو ابنِ اسحاق پر فوقیّت رکھتے ہیں۔

اصمعی

ابو سعید عبد الملک اصمعی بصرہ میں ۲۱۳ھ میں پیدا ہوئے اور ماہر لسانیات، علم اللغتہ کے با کمال محقق، اور ممتاز مؤرخ کی حیثیت سے شہرت حاصل کی۔ مبداءِ فیض سے انہیں بلا کا حافظہ اور غیر معمولی ذہانت کا وافر ذخیرہ ملا تھا۔ اس لیے جلد ہی انہوں نے علومِ متداولہ پر عبور حاصل کر لیا۔ حتیٰ کہ اُن کی شہرت بغداد کے پایۂ تخت تک پہنچ گئی۔ اور ہارون الرشید نے انہیں اپنے بیٹے امین الرشید کا اتالیق (مؤدّب) مقرر فرمایا۔ اصمعی پر شاہی نوازشات کی بارش ہونے لگی۔ لیکن انہوں نے زہد و قناعت کی زندگی کا نمونہ قائم رکھا۔ دربار کے اکثر اہلِ کمال اُن سے خم کھانے لگے۔ لیکن انہوں نے خاکساری اور ملنساری کی روش کو برقرار رکھا۔

الاصمعی نے لسانیات اور لغت پر متعدد کتابیں لکھی ہیں۔ لیکن ہمیں اُن سے سردست کوئی سروکار نہیں۔ ہم یہاں ان کی کتاب "فتوح السلاطین" کو زیرِ بحث لانا چاہتے ہیں۔ جس میں ماقبل اسلام زمانے کے ملوک و سلاطین کے حالات سپردِ قلم کیے گئے ہیں اور قومِ عرب کی معاشرتی زندگی اور تہذیبی روایات پر فاضلانہ بحث کی گئی ہے۔ ایامِ جاہلی میں عربوں کے ہاں باقاعدہ تاریخ نویسی کا کوئی قابلِ ذکر سرمایہ موجود نہیں۔ جاہلیّت کی جو لڑائیاں "ایام العرب" کے نام سے مشہور ہیں۔ ان کے بارے میں چند متفرق اشعار یا نظمیں ضرور لکھی گئیں۔ لیکن یہ شرف اصمعی کو حاصل ہے کہ اس نے اس قدیم دَور کے بارے میں تاریخی مواد فراہم کیا۔ فاضل مؤلف نے عربوں کی قبائلی لڑائیوں کے پہلو بہ پہلو اس قدیم تمدّن کا حال بھی لکھا ہے جو کبھی دجلہ و فرات کے کنارے، کبھی وادیٔ نیل کے دامن میں اور کبھی بحر کے ساحلی علاقوں میں پروان چڑھا تھا اور جس کے عرب وارث و امین تھے۔ چنانچہ "فتوح السلاطین" میں قدیم عرب فرمانرواؤں کے ادوارِ حکومت کے تحت ابو سعید الاصمعی عربوں کی معاشرتی اور تہذیبی ترقی کی رُوداد ایسے مفاخرانہ انداز سے پیش کرتے ہیں کہ عربوں کے تمدّن کا نقشہ بھی نگاہوں

کے سامنے کھنچ جاتا ہے اور اس کی عجمی تہذیبوں پر برتری کا سکہ قاری کے دل پر بیٹھ جاتا ہے۔

علامہ اصمعی یہودیوں کے ساتھ عربوں کے بین الاقوامی تعلقات کا تذکرہ کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ یونانی اور رُومی اقوام عربوں سے خوب واقف تھیں۔ اور عرب کے ریگزاروں کو دولت کی سرزمین سمجھتی تھیں۔ جہاں کے باشندے حریت کے متوالے، اور آزادی کے شیدائی تھے۔ اس بارے میں فاضل مصنّف نے لکھا ہے کہ :-

"ایران کے فرمانروا خسرو پرویز کے دربار میں ایک مرتبہ بازنطینی (رومن ایمپائیر)، ہندوستان اور چین کے سفیروں کے رُو برُو عرب نمائیندوں کا ایک مذاکرہ ہوا جس میں عربوں کے وفد نے اپنی قوم کے ان امتیازی اوصاف یا اسباب فضیلت کو مصرّح انداز میں پیش کیا۔ جو صحرا کے قدرتی ماحول کے نتیجہ کے طور پر ان میں پیدا ہوگئے تھے" اپنے مؤقف کی وضاحت کرتے ہوئے علامہ اصمعی فرماتے ہیں کہ اہلِ رُوما کے فرمانرواؤں اور جرنیلوں نے ساری دنیا سے اپنی بالادستی کا لوہا منوایا۔ لیکن وہ کبھی عربوں کو مغلوب نہ کر پائے۔ اس سلسلے میں علامہ موصوف نے رومیوں کے ایک حملے کا (۲۴ ق م) حوالہ دیا ہے۔ جس میں دس ہزار رومیوں کا لشکر جرار سرزمین عرب پر حملہ آور ہوا۔ تاکہ عربوں کے ان تجارتی راستوں اور گذرگاہوں پر قبضہ جمالے۔ جن پر عربوں کی اجارہ داری تھی۔ لیکن اس رومی لشکر کو منہ کی کھانا پڑی اور وہ عربوں کے جذبۂ حرّیت پسندی کو فنا نہ کر سکے۔

علامہ اصمعی کی تاریخی کاوش کی قدر و قیمت کا اندازہ اس امر سے کیا جا سکتا ہے۔ کہ انہوں نے تاریخ انسانی کے اُس گوشے کو بے نقاب کیا۔ جو جاہلیّت و جہالت کے دبیز پردوں میں مستور تھا۔ اور عربوں کی تاریخ کا وہ باب رقم کیا جس کے بارے میں کوئی قابلِ ذکر تحریری مواد سرے سے موجود نہ تھا۔ اور اس عظیم الشان کام میں علامہ ممدوح کو محض اس لیے کامیابی حاصل ہُوئی کہ وہ سرزمین عرب کے اماکن، (تاریخی مقامات) اور سلاطین کے حالاتِ زندگی اور معاشرتی احوال کے بارے میں گہری واقفیّت رکھتے تھے۔ مزید برآں قبائل کے انساب کی اُنہیں پوری معرفت حاصل تھی اور ان قبائل کے لغت و نحو پر اُنہیں کامل عبور حاصل تھا۔ خصوصاً یہ کہ علامہ موصوف ایامِ جاہلیّت کی شاعری کے مزاج سے آشنا اور رمز شناس تھے۔

اَلواقِدی

دوسری صدی ہجری میں شمعِ رسالت کے پروانوں کے دلوں میں قدرتی طور پر آنحضرتؐ کے اقوال، افعال، اخلاق، عادات، تعلیمات اور سیرتِ پاک کو جاننے کا شوق پیدا ہوا۔ خصوصاً حضور سردرِ کائناتؐ اور صحابہ کرامؓ کے جنگی کارناموں کا تجسّس اُبھرا۔ اس مرحلہ پر سیرت نگاروں اور مؤرخین کی ایک جماعت آگے بڑھی اور اس نے سیرت و مغازی کے موضوع پر تصانیف سپردِ قلم کرنا شروع کیں۔ جن میں ابوعبداللہ محمد بن عمر بن واقدی کا نام نامی یادگارِ زمانہ رہے گا۔ جو دوسری صدی ہجری کے سیرت نگاروں اور مؤرخوں کے امام اور پیشرو ہیں۔

عمر بن واقدی نے بغداد میں مالک بن انس ثعبان ثوری اور دوسرے اکابر علمائے اسلام سے تعلیم حاصل کی اور تفسیر، فقہ، انساب اور تاریخ کے میدان میں کام کیا۔ خصوصاً بحیثیتِ مؤرخ غیر معمولی شہرت حاصل کی۔ ہارون الرشید اور اس کے وزیر باتدبیر یحییٰ بن خالد، دونوں نے اُنہیں شرفِ تقرب بخشا۔ ابن حجر عسقلانی کی روایت کے مطابق ہارون الرشید نے انہیں بغداد کے مشرقی حصے کی قضاۃ کا عہدہ تفویض کیا۔ مامون الرشید نے بھی انہیں اس عہدے پر برقرار رکھا اور ان کی توقیر و تعظیم میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی

الواقدی بہت سی کتابوں کے مؤلف ہیں جن میں سے "المغازی"۔ فتح افریقہ۔ فتح العجم۔ فتح مصر و اسکندریہ۔ اخبار عسکر۔ فتوحُ العراق۔ سیرت ابی بکر۔ کتاب الصّفین، مقتل الحسین۔ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

متذکرہ بالا تالیفات میں سے کتاب تاریخ والمغازی ہم تک مکمل صورت میں پہنچی ہے۔ اس میں غزواتِ نبویؐ کا جو بیان ہے وہ محمد بن اسحاق کی سیرت الرسول سے کہیں زیادہ مکمل، مفصل اور جامع ہے۔ کتاب المغازی میں مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کی ابتدائی تاریخ بتمام و کمال آگئی ہے اور

تاریخ اسلام کے بعض اہم پہلو خاص طور پر اُجاگر ہو گئے ہیں۔ مثلاً وفات نبویؐ، ابوبکرؓ کی بیعت، شہادتِ امام حسین وغیرہ جن میں اُن کا بیان مدائنی اور ہشام الکلبی جیسے اخباریین سے زیادہ اہم ہے۔ اس کتاب کے بارے میں محققین کا خیال ہے کہ واقدی نے ملکی فتوحات اور دیگر تاریخی واقعات کے جو سنین لکھے ہیں۔ ان کی تصدیق دوسری تاریخوں سے بھی ہوتی ہے۔

ابنِ ندیم نے الفہرست میں اور یاقوت رومی نے مُعجم الاُدباء میں، الواقدی کی بیس اکیس کتابوں کے نام گنائے ہیں جو بیشتر تاریخی واقعات، بالخصوص غزوات اور فتوحات کے بارے میں ہیں۔

علّامہ طبری اور دیگر مؤرخینِ اسلام نے علّامہ واقدی سے اکثر و بیشتر استفادہ کیا ہے۔ ڈاکٹر پروفیسر عنایت اللہ کا خیال ہے کہ بعد کے زمانے میں لوگوں نے فتوحاتِ اسلامیہ کی افسانہ آمیز تاریخیں لکھ کر اُنہیں واقدی کی طرف منسوب کر دیا، اور اس کی صداقت اور شہرت کو داغدار کیا۔ لیکن جہاں تک اُن کی اپنی تالیفات خصوصاً کتاب التاریخ والمغازی کا تعلق ہے اُسے تمام ناقدینِ تاریخ نے ہر قسم کے رطب ویابس سے پاک قرار دیا ہے۔ اور غزوات النبیؐ کے سلسلہ میں اُن کی تالیف کو بیش قیمت سرمایہ تسلیم کیا ہے۔ فان کریمر نے مغازی کا ایک ایڈیشن کلکتہ سے شائع کروایا تھا اور اُس کا ایک اعلیٰ نسخہ برٹش میوزیم میں محفوظ ہے۔ مشہور مستشرق ولہازن (WELLHA USEN) نے "کتاب المغازی" کا جو ترجمہ جرمن زبان میں کیا، وہ اسی نسخے کا مرہونِ منّت ہے۔

اگرچہ بعض محدّثین کرام نے الواقدی کو علمِ حدیث میں ثقہ راویوں میں شمار نہیں کیا۔ لیکن مؤرخین اسلام انہیں "سیرت و مغازی" کے فن کا امام مانتے ہیں۔ اس سلسلہ کے چند شواہد درج ذیل ہیں۔

علّامہ خطیب بغدادی لکھتے ہیں "الواقدی ان لوگوں میں سے ہیں جن کے آوازۂ شہرت سے مشرق و مغرب گونج رہے ہیں۔

ابن العماد حنبلی اُنہیں "علم کا ظرف" قرار دیتے ہیں۔

علّامہ ابنِ خلکان لکھتے ہیں۔ "الواقدی امام، عالم اور کثیر التصانیف بزرگ ہیں"۔

علّامہ ابنِ سعد (کاتب الواقدی) لکھتے ہیں "کہ واقدی مغازی، سیرت اور فتوحات، احکام

اور محدثوں میں علماء کے اختلافی اور متفق علیہ مسائل ان سب کے متبحر عالم تھے۔

الواقدی کے علم و فضل کی اس سے بڑھ کر اور کیا دلیل ہو سکتی ہے کہ محمد بن سعد " صاحب طبقات" جیسا علامۂ دہر اور یگانۂ روزگار، اُن کا کاتب اور تلمیذ رشید تھا!

جدید محققین بھی الواقدی کی فضیلتِ علمی کے معترف ہیں۔

مولوی خدا بخش کی رائے یہ ہے کہ تاریخی مواد کو ترتیب دینے میں الواقدی اپنے پیش رو مؤرخین پر سبقت لے گئے۔ ان کی تصنیف میں ہمیں ایک منظم، مرتب، مربوط اور مسلسل تاریخی کتاب کی شان دکھائی دیتی ہے۔ جس میں ظرافت کی چاشنی اور منفرد اسلوبِ نگارش کی تازگی اور شادابی عیاں ہے۔

عبدالعزیز دوری رقمطراز ہیں کہ اسناد کی جانچ پڑتال کے بارے میں علامہ واقدی ابن اسحاق کی نسبت زیادہ محتاط ہیں۔ واقعات اور مہ و سال کے تعین کے بارے میں وہ کہیں زیادہ سائینٹفک اور ناقدانہ ذہن رکھتے تھے۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی خلافت و ملوکیت میں لکھتے ہیں۔ ابن سعد کے استاذ واقدی کو حدیث میں ضعیف کہا گیا ہے۔ مگر سیر و مغازی کے معاملہ میں تمام اہلِ حدیث نے ان سے روایات لی ہیں۔

واقدی کا اندازِ تحقیق :۔

واقدی کا غزوات کی تحقیق کا شوق اس درجہ بڑھا ہوا تھا کہ مقامات غزوہ کا خود جا جا کر مشاہدہ فرماتے۔ اُن کا بیان ہے۔" میں صحابہ کرام کی اولاد اور ان کے موالی میں جس کسی سے ملتا۔ اس سے دریافت کرتا۔ کیا آپ نے فلاں واقعہ کی نسبت اپنے بزرگوں سے سُنا ہے کہ وہ کہاں پیش آیا اور وہ کہاں قتل کیے گئے ؟ جواب اثبات میں ملتا تو خود اس جگہ جا کر اپنی آنکھوں سے اس کا مشاہدہ کرتا۔ چنانچہ میں اس سلسلہ میں مریسیع گیا اور اس مقام کو خوب اچھی طرح دیکھا۔

محمد ابن سعد الزھری

تاریخ شاہد ہے کہ قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں نے جنگی قیدیوں اور ان کی اولاد کو اپنا غلام بنانے کے باوصف ایسی اچھی تربیت دی کہ علم وفضل کے پہلو میں صحابہ وتابعین کی ہمسری کا دعویٰ کرنے لگے۔ ایسے ہی خوش بخت لوگوں میں محمد بن سعد (کاتب الواقدی) ہیں جو عہدِ خلافتِ راشدہ سے قریب ترین زمانے کے مصنف ہیں۔ نہایت وسیع الاطلاع بزرگ ہیں اور نہ صرف سیر ومغازی کے معاملے میں ان کی ثقاہت پر تمام محدثین ومفسرین نے اعتماد کیا ہے بلکہ تمام اساطینِ علمِ حدیث بھی اُنہیں "ثقہ"، "ثبت"، "صدوق" اور "حجت" مانتے ہیں۔ یہاں تک کہ خطیب بغدادی فرماتے ہیں۔ "محمد بن سعد کی بیان کردہ حدیثیں ہی ان کی سچائی کی دلیل ہیں۔ کیونکہ وہ ان کے اخذ وانتخاب میں بڑی چھان پھٹک کرتے تھے۔"

محمد بن سعد ۱۶۸ھ میں بصرہ میں پیدا ہوئے اور بغداد میں اپنے مربّی (آقا) کے ہمراہ آباد ہو گئے جہاں انہوں نے مشاہیر آئمۂ علم وفن سے استفادہ کیا اور جب آزاد ہوئے تو انہوں نے اپنی ساری زندگی نشۂ علم، اور اپنی ساری توانایاں اشاعتِ دین کے لیے وقف کر دیں۔ علامہ موصوف غرائب القرآن، فقہ، تاریخ، ادب، سیرتِ نبوی، اخبارِ صحابہ، غرضیکہ تمام مروّجہ علوم کے جامع اور ماہر تھے خصوصاً سیرت ومغازی کے فن میں اُنہیں کامل دستگاہ حاصل تھی۔ سنہ ۲۳۰ھ میں انہوں نے وفات پائی۔ علامہ موصوف نے جو کتابیں یادگار چھوڑی ہیں ان میں سے چند کے نام یہ ہیں:۔

کتاب الطبقات الکبیر

الطبقات صغیر

تاریخ اسلام

غرائب الحدیث والفقہ

یہ چاروں کتابیں مرورِ ایام سے ناپید ہو گئی تھیں۔ لیکن شاہِ جرمنی کے ایماء پر جرمنی محقق

پروفیسر زخاؤ کی مساعی جمیلہ سے یہ بلند پایہ تالیف منظرِ عام پر آ گئی۔ پروفیسر موصوف بڑی تحسین و آفرین کے مستحق ہیں کہ انہوں نے یہ گوہرِ شب چراغ ڈھونڈ نکالا جس کی تابانی و درخشانی سے ایک عالم روشن ہے۔ اس گراں قدر تالیف کا موضوع صحابہ کرام (رضوان اللہ علیہم اجمعین) اور تابعین عظام کے سوانح حیات کا بیان ہے۔ مضامین کے تنوع اور مباحث کی جامعیت کے اعتبار سے یہ کتاب "الطبقات الکبیر" کہلاتی ہے اور اجمالاً اسے مؤلف کے نام نامی پر طبقات ابنِ سعد کہا جاتا ہے۔ اس تصنیف کی مجلدات کے بارے میں اختلاف رائے ہے۔ صاحب کشف الظنون نے اس کی پندرہ جلدیں بتائی ہیں۔ جبکہ علّامہ شبلی نے اس کی بارہ جلدوں کا ذکر فرمایا ہے۔

اس نادر الوجود تالیف کی پہلی دو جلدوں میں سیرت و مغازی رسولؐ کا بیان ہے۔ بدر، اُحد حنین، احزاب اور تبوک کے معرکوں کی روداد بڑی دلچسپ اور مفصّل ہے۔ بقیہ دس جلدوں میں بدری صحابہ، مہاجرین، اہلِ مدینہ، کوفیین، انصار، صحابیات، صحابہ کرام اور تابعین کے سوانح حیات درج ہیں۔ پہلی دو مجلدات میں ابنِ سعد نے اپنے استاذ واقدی کی کتابوں سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔ بقیہ مجلدات میں انہوں نے دوسرے متعدد مستند و معتبر مصادر سے سرمایۂ علم حاصل کیا ہے اور اس طرح ایک لافانی تالیف مرتب فرما دی ہے جس سے ہر زمانے کے سیرت نگاروں اور مؤرخوں نے خوشہ چینی کی ہے۔ علامہ جلال الدین سیوطی جیسے متبحّر عالم نے اس تالیف کا ملخص مرتّب فرمایا جس سے اس کتاب کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اس بیش قیمت تالیف میں ایسے ایسے سبق آموز واقعات اور ایمان افروز اشارات ملتے ہیں جو کسی دوسری تاریخ میں نہیں ملتے چنانچہ طبقاتِ کبیر جہاں صحابہ اور تابعین کے بارے میں علم آموز قاموس ہے وہاں اخلاق و کردار کو سنوارنے کے لیے نسخہ کیمیا کا حکم رکھتی ہے۔ ایک طرف یہ تصنیف فنِ تاریخ کا قابلِ فخر سرمایہ ہے۔ تو دوسری طرف علم الاخلاق کا گنج گراں مایہ ہے۔ سچ فرمایا تھا علامہ خطیب بغدادی نے کہ ابنِ سعد نے صحابہ کرام اور تابعین عظام کے طبقات میں ایک بڑی کتاب لکھی ہے اور حق یہ ہے کہ خوب اور بہت خوب لکھی۔

محمد بن سعد کے علمی مقام و مرتبے کا اندازہ درج ذیل اہلِ علم کی آراء سے کیا جا سکتا ہے۔ بلاذری جو ان کا شاگردِ خاص تھا اپنے استاذ کی فضیلتِ علمی کا بے حد مدّاح اور ثنا خوان ہے۔

ابن خلکان لکھتے ہیں کہ محمد بن سعد متبحّر عالم ہیں اور سچے اور قابلِ اعتماد ہیں۔ حافظ ذہبی محمد بن سعد کو الحافظ اور العلاّمہ کے القابات سے یاد کرتے ہیں۔ امام احمد بن حنبل ابنِ سعد کے ذخیرۂ احادیث سے مستفید ہوتے رہے۔ ابن حجر عسقلانی انہیں ثقہ اور محتاط حفاظِ حدیث میں شمار کرتے ہیں۔ حافظ سخاوی فرماتے ہیں "ابن سعد ثقہ ہیں۔ اگرچہ ان کے استاذ واقدی ضعیف ہیں۔" ابن تغری بردی لکھتے ہیں۔ "تمام حفاظ حدیث نے (یحیٰ بن معین کے سوا) اُن کی توثیق کی ہے۔" یہ ایک عجیب بات ہے کہ ابن سعد "کاتب الواقدی" ہونے کی وجہ سے مشہور ہیں۔ لیکن وہ اپنے استاذ واقدی سے کہیں زیادہ نامور اور معروف ہیں اور وہ اصحابِ علم جو ان کے استاذ مکرم پر نکتہ چینی کرتے ہیں۔ وہ اس تلمیذ رشید کی عظمت کا سکہ مانتے ہیں۔ غرضیکہ قدماء مصنّفین اُنہیں تمام علوم میں سرآمدِ زمانہ تسلیم کرتے رہے ہیں۔

ابُو حنیفہ دِینوری

ابو حنیفہ احمد بن داؤد دینوری المتوفی ۲۸۲ھ عراق عجم کے شہر دینور میں تیسری صدی ہجری میں پیدا ہوئے اور مختلف علوم و فنون مثلاً علم حساب، علم ہندسہ اور علم نباتات اور علم فلکیات پر بڑی جامع مانع اور علم آموز تالیفات سپردِ قلم فرمائیں۔ کتاب ُالنبات' ان کی معرکتہ الآراء تصنیف ہے۔ جس میں انہوں نے علمِ نباتات پر بڑی عالمانہ بحثیں کی ہیں۔ کتاب الانواء بارش اور نکھتروں کے بارے میں ہے[۱]۔ ابو حنیفہ دینوری نے قرآن مجید کی شرح تیرہ جلدوں میں لکھی۔ علم الفرائض پر کتاب فی حساب الدور، اور کتاب الوصایا مرتب فرمائیں۔ علمِ بلاغت کے بارے میں کتاب الفصاحتہ اور کتاب الجمع والتفریق لکھیں۔ کتاب الشعر والشعراء میں شاعروں کے حالات بیان فرمائے۔ جواہر العلم اُن کے حکیمانہ اقوال کا مجموعہ ہے۔ علمِ حساب پر اُن کی تین تالیفات مشہور ہیں، کتاب البحث فی حساب الھند، کتاب الجبر والمقابلہ اور کتاب نوادر الجبر! تاہم علمِ نباتات، اور علمِ لغت میں اُن مسلم الثبوت امام مانا جاتا ہے۔ علمِ فلکیات میں کتاب القبلتہ الزوال اور کتاب الکسوف فاضل مؤلف کی علمی یادگاریں ہیں۔

علمِ تاریخ کے موضوع پر ابو حنیفہ نے الاخبار الطوال مرتب فرمائی تھی۔ جو تقریباً چار سو صفحات پر مشتمل ہے اور یہی تالیف موضوعِ سُخن ہے۔ عام عرب مؤرخین کی طرح ابو حنیفہ دینوری نے آدمؑ کے زمانے سے لے کر آنحضورؐ کے عہدِ سعادت تک سلسلۂ کلام بڑھایا ہے۔ گرچہ سیرت نبوی کا بیان بڑا مجمل ہے۔ انہوں نے خلافتِ راشدہ کے دورِ حکومت پر بڑی مفصل بحث کی ہے۔ علامہ موصوف ہمیں وضاحت سے بتاتے ہیں کہ ایران کس طرح فتح ہوا؟ اور خالد بن ولید نے کیا کارنامے انجام دیئے۔

---

[۱] البیرونی نے اپنی جداول میں اس کا تذکرہ کیا ہے۔ ۱

قادسیہ اور نہاوند کے معرکے کی روداد خاصی طویل اور دلچسپ ہے۔ ایرانی سلطنت کے زوال اور عربوں کے عروج کا تذکرہ کرنے کے بعد فاضل مؤلف، مسلمانوں کی خانہ جنگی کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں امیر معاویہؓ اور حضرت علیؓ کی باہمی کشمکش پر بھرپور انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے اور خوارج پر بڑا جامعہ مقالہ قلم بند کیا گیا ہے۔ اُموی دَور سے ابو حنیفہ کو صرف اتنی دلچسپی ہے کہ اس دور کی مذہبی اور سیاسی تحریکوں کو نمایاں کر دیا جائے۔ شہادتِ حسینؓ کے واقعات زیادہ تفصیل سے سپُردِ قلم کیے گئے ہیں۔ خوارج کی بغاوت اور مدّعی نبوت، مختار کے حالات پر خاصی توجہ دی گئی ہے۔ بعد ازاں بنو امیہ کی تاریخ مختصر اور جامع انداز میں بیان کی گئی ہے اور ان کے زوال کے اسباب کی طرف بلیغ انداز میں اشارے کیے گئے ہیں۔ عباسی تحریک کے عروج، بغداد کی تاسیس اور امین و مامون کی باہمی خانہ جنگی پر بڑی مفصّل بحث کی گئی ہے۔ حتیٰ کہ معتصم باللہ کی وفات پر طویل تاریخی داستان ختم ہو جاتی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ "الاخبار الطوال" میں فاضل مؤلف حالات و واقعات کو ماہ و سنین کی ترتیب سے نہیں پیش کرتے۔ بلکہ وہ تاریخی حوادث کو مسلسل قصّے کے پیرائے میں بیان فرماتے ہیں یہی تسلسل اور ربط، کتاب کو بلند پایہ تالیفات کے درجہ تک پہنچا دیتا ہے۔ اگرچہ دینوری کو زیادہ تر سائنسی علوم مثلاً نباتات اور ریاضی سے دلچسپی تھی۔ لیکن ان کی تحریر میں غیر معمولی ادبی چاشنی ہے۔ مدعی نبوت مختار کے حالات، خراسان میں اُمویوں کے زوال اور نصر بن سَیار کی جنگ کے بیان میں انہوں نے بڑا زورِ قلم دکھایا ہے۔ نصر بن سیار کی جنگ میں تو اعلیٰ ترین ڈرامائی منظر نگاری کا نمونہ ملتا ہے۔ مغربی محقق مارگولیتھ ان کے ادبی اسلوب نگارش کا بڑا مداح اور ثنا خواں ہے۔ اپنی تالیف میں فاضل مؤلف نے جو فارسی کے اقتباسات دیئے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں عربی کے علاوہ فارسی زبان پر پورا عبور حاصل تھا اور اس حقیقت کا ثبوت بھی مل جاتا ہے کہ وہ فارسی الاصل تھے۔ ابو حنیفہ دینوری نے اپنی تالیف میں جابجا اشعار نقل کیے ہیں جن کی بدولت اُن کی تالیف نظم و نثر کا حسین شہ کار بن گئی ہے۔

مقام :۔

ممتاز لغوی ابو حیّان نے جاحظ سے متعلقہ اپنی تالیف میں لکھا ہے۔" دینوری، جاحظ اور ابو زید

بلخی ہم مرتبہ عالم ہیں اور مثلث علمی کا ہر زاویہ لاجواب اور بے عدیل ہے۔ حاجی خلیفہ کے سوا باقی سارے ہی سوانح نگار ابو حنیفہ دینوری کی کتابوں کی فہرست پیش کرتے چلے آتے ہیں۔ جس سے دینوری کے علمی مرتبے کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ابن العدیم ان کی تالیف کا حد درجہ قدردان اور ثنا خوان تھا۔ مشہور مستشرق طوطیو کراچ کوفسکی کے نزدیک ساسانوی دور سے متعلق حقائق پیش کرنے میں "اخبار الطوال" درجۂ اوّل کی اہمیت اختیار کر لیتی ہے[1] ڈاکٹر حمید اللہ کے نزدیک دینوری کا شمار اُن اوّلین مؤلفوں میں ہوتا ہے جنہوں نے تاریخ میں عالم گیریت پیدا کی[2]

---

[1] ترجمہ "الاخبار الطوال" از مرزا منور صفحہ ۵۹

[2] ایضاً صفحہ ٦٧

البلاذری

تیسری صدی ہجری کے مشہور مورخ احمد بن یحیٰی ابن جابر البغدادی البلاذری کا شمار ان مشاہیر اسلام میں ہوتا ہے جو گہوارۂ علم و دانش (بغداد) کی بزم علم و ادب کی رونق تھے اور اس عہدِ زرین کے گلِ سرسبد تھے۔ حسنِ اتفاق سے البلاذری کو بغداد کے اکابر علماء سے استفادے کا شرف حاصل ہوا۔ جس کے باعث ان کی خداداد صلاحیتیں چمک اُٹھیں۔ البلاذری کو فنِ تاریخ سے فطری مناسبت اور قلبی لگاؤ تھا۔ چنانچہ انہوں نے ابنِ ندیم کی تصریح کے مطابق چار کتبِ تاریخ (کتاب البلدان الصغیر، کتاب البلدان الکبیر، کتاب الاخبار و الانساب اور کتاب عہدِ اُردشیر) مرتب فرمائیں جن پر یاقوت رومی نے ایک اور تالیف کتاب الفتوحُ البلدان کا مزید اضافہ کیا ہے۔ علامہ موصوف دوَلِ اسلامیہ کی ایک مبسوط و مکمل تاریخ مرتب کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ جو بقول حاجی خلیفہ چالیس جلدوں پر مشتمل ایک عظیم الشان تالیف کی صورت میں مرتب ہوتی۔ لیکن ان کی عمر نے تادیر وفا نہ کی۔ اگر یہ تالیف مکمل ہو جاتی تو البلاذری کا علمی مقام کہیں زیادہ بلند تر ہوتا۔

البلاذری کے ذوقِ تحقیق کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے بغداد کے اکابر علماء کی روایتوں کی سماعت پر اکتفا نہ کیا۔ بلکہ دور دراز ممالک کا سفر بھی کیا اور وہاں کے جید علماء سے بھی استفادہ کیا۔ انہوں نے شمال الشام کے تمام شہروں کی خاک چھانی۔ وہاں سے مابین النہرین (الجزیرہ) اور تکریت کے گوشے گوشے کی سیاحت فرمائی۔ اور تمام تاریخی روایات کا تقابلی موازنہ کرنے کے بعد اپنی گراں قدر تالیفات مرتب فرمائیں۔ جن میں کتاب الفتوح البلدان شہرتِ عام اور حیاتِ دوام حاصل کر چکی ہے۔ ایک المانی مورخ نے بجا طور پر لکھا ہے کہ البلاذری ان مورخوں میں سے ہیں جو اپنے جمع کردہ مواد میں سے صحیح روایتیں چھانٹنے میں سلامتیٔ ذوق کے لیے ممتاز ہیں۔

علامہ موصوف کی حریتِ فکر اور آزادیٔ رائے کا یہ حال تھا کہ اگرچہ وہ دولتِ عباسیہ کے دامن میں پلے، انہی کے زیرِ سایہ پروان چڑھے۔ المتوکل اور المستعین کے معتمد اور ندیم خاص رہے۔ المعتز

کے بیٹے عبداللہ کے اتالیق (مؤدب) مامور ہوئے۔ لیکن انہوں نے اپنی تالیف کتاب الفتوح (البلدان) میں مجرّد تاریخی واقعات سپردِ قلم فرماتے ہیں۔ نہ خلفائے عباسیہ کی مدح کی ہے اور نہ ان کے دشمنوں کے بارے میں زبانِ طعن کھولی ہے۔ یہاں تک کہ انہوں نے سرے سے اپنی کتاب (فتوح البلدان) کا کوئی مقدمہ (پیش لفظ) ہی نہیں لکھا۔ تاکہ اس عہد کے رواج اور معمول کے مطابق انہیں اپنے دور کے خلفار کی ثناخوانی کی زحمت نہ اٹھانی پڑے۔

البلاذری کی مفکرانہ عظمت کا اندازہ اس امر سے کیا جاسکتا ہے کہ تاریخ نویسی کے ابتدائی دور میں انہوں نے فتوحات کے پہلو بہ پہلو عمرانی، تہذیبی اور معاشی مباحث پر جملہ ابواب میں جابجا اشارے کیے ہیں اور اپنی کتاب کے آخری دو باب تو "رسم الخط اور سکوں (نقود) کے مباحث کے لیے وقف کر دیتے ہیں۔ دائرۃ المعارف اسلام کے مقالہ نگار نے کیا خوب لکھا ہے۔" البلاذری نے تاریخی وقائع کے دوش بدوش تہذیبی و عمرانی نوعیت کا مواد بڑے قرینے سلیقے سے یکجا مرتب کر دیا ہے۔ نیز ٹیکسوں اور سکوں کے بارے میں بڑی قیمتی معلومات فراہم کی ہیں۔"

اس تالیف میں عراق کے ان قدیم شہروں کے احوال مذکور ہیں جن کے نقوش مرورِ ایام سے مٹ گئے۔ علامہ ممدوح کی مؤرخانہ احتیاط و دیانت کی یہ شان ہے کہ جہاں اُنہیں راویوں کے نام اچھی طرح معلوم ہیں وہاں انہوں نے پورا سلسلۂ اسناد یوں درج کیا ہے کہ حدّثنی، حدّثنا فلاں و فلاں اور جہاں اُنہیں راویوں کے بارے میں پوری تحقیق نہیں ہوتی وہاں وُہ محض "قَالَ" یا "قالوا" لکھ کر واقعات درج فرماتے ہیں۔ تاکہ ایسی روایات بالکل الگ پہچانی جاسکیں۔

غالباً اسی لیے فتوح البلدان درجۂ اسناد کے لحاظ سے علامہ طبری کی تصنیف کتاب الرسل والملوک اور ابنِ سعد کی تالیف طبقات الکبیر کے ہم رتبہ سمجھی جاتی ہیں۔

فاضل مؤلف کی وسعتِ نظری کا بیّن ثبوت یہ ہے کہ انہوں نے اپنی تالیف بلکہ (تالیفات) میں ایران کی تاریخی روایات پر خاص طور پر توجہ مبذول فرمائی ہے۔ ڈاکٹر عنایت اللہ مرحوم نے بجا طور پر تاریخ ابن خلدون کے دیباچے میں تصریح فرمائی ہے کہ البلاذری نے پہلوی ادب کی بعض کتابوں کا عربی میں ترجمہ کیا تھا جس سے عربوں کو نہ صرف ایران کی قدیم تاریخ کا علم حاصل ہوا بلکہ انہیں ایرانیوں کی تاریخ نویسی سے بھی واقفیت پیدا ہوئی۔ جس کے نتیجہ کے طور پر مسلم مؤرخوں کی تالیفات میں

ایران کی قدیم تاریخ بھی شامل ہونے لگی۔

فتوح البلدان کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصہ میں عرب شام، جزیرہ، آرمینیہ، مصر و مغرب، افریقہ سوڈا اور جبال کے علاقوں کی فتوحات کا بیان ہے۔ دوسرے حصے میں آذر بائیجان، اضلاع اہواز (کرمان) اور سیستان خصوصاً سندھ کی فتوحات کا مختصر تذکرہ ہے۔ پہلے حصے میں آٹھ اور دوسرے حصے میں تین ابواب شامل ہیں۔ فتوح البلدان کا وہ حصہ بڑا ایمان افروز اور علم آموز ہے۔ جس میں عمرؓ فاروق کے دور کی فتوحات کا ذکر ہے جسے پڑھ کر جناب فاروقِ اعظم کے بارے میں اس کے سوا کوئی دوسری رائے نہیں قائم کی جاسکتی کہ آنجناب دولتِ اسلامیہ کے موسس اعظم، اسلامی فضائل کے بہترین مجسمے اور عالم اسلام کے عظیم مقتدا و پیشوا تھے۔

یہ بات جاننا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ اس بلند پایہ تالیف کے مضامین و مندرجات میں جا بجا ایسے اشارے ملتے ہیں جن سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ یہ یادگارِ زمانہ کتاب خلیفہ المستعین کے زمانے میں مرتب ہونا شروع ہوئی تھی۔ تا آنکہ المعتز کے عہدِ حکومت میں پایہ تکمیل کو پہنچی۔

البلاذری کی مؤرخانہ عظمت کا اندازہ اس امر سے کیا جاسکتا ہے کہ معاصرین و متاخرین سب کے سب انہیں عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ چنانچہ ابنِ ندیم تاریخ حلب میں رقم طراز ہیں۔ "البلاذری باکمال ادیب اور نغز گو شاعر ہیں۔ وہ معلومات کا مخزن و معدن ہیں۔ انھوں نے بہت سی قابلِ قدر تالیفات مرتب کی ہیں۔

عبداللہ بن احمد ابوطاہر فرماتے ہیں۔ "البلاذری کا شمار ایسے انشاء پردازوں اور شاعروں میں ہوتا ہے جنھوں نے نادر تالیفات یادگار چھوڑی ہیں"۔

خدابخش مرحوم فرماتے ہیں۔ "البلاذری کا اسلوبِ نگارش ایک سلجھے ہوئے دماغ اور منجھے ہوئے ادبی ذوق کا منہ بولتا ثبوت ہے، جو کسی مہذب معاشرے میں پروان چڑھا ہو اور روایت پرستی کی جکڑ بندیوں سے کلیتاً آزاد ہو"۔

دائرۃ المعارف اسلام کا مقالہ نگار "البلاذری" کو تیسری صدی ہجری کا عظیم ترین مؤرخ قرار دیتا ہے۔

مارگولیتھ کا خیال ہے کہ البلاذری علمِ مغازی پر لکھنے والوں کا سرخیل و سرتاج ہے۔

ایم ڈی خویہ کا کہنا ہے کہ اس کتاب کی تعریف و توصیف کا حق ادا کرنا مشکل ہے۔ صرف اتنا کہا جاسکتا ہے کہ یہ کتاب ایک ایسے آئینے کی مانند ہے۔ جس میں دولتِ اسلامیہ کے ابتدائی عہد کی مکمل تصویر دیکھی جاسکتی ہے اور یہ مشاہدہ کیا جاسکتا ہے کہ کیونکر وہ قوم جو کبھی تہذیب و تمدن سے ناآشنا تھی۔ اپنے دین کی اشاعت کی خاطر امّتِ عربیہ کی عظمت و سیادت کا سنگ بنیاد رکھنے میں کامیاب ہوئی۔

○

ابنِ قتیبہ

ابنِ قتیبہ دینوری ایک طرف بغداد کے نحوی مکتب کے نمائندے شمار ہوتے ہیں اور دوسری طرف اُنہیں تیسری صدی ہجری کے نامور مؤرخین میں شمار کیا جاتا ہے۔ ابنِ قتیبہ دینوری کا پورا نام ابوعبد اللہ محمد بن مسلم تھا۔ آپ ۲۱۳ھ میں کوفہ کے مقام پر پیدا ہوئے اور وُہیں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ ابوحاتم سجستانی، اور اسحاق بن راہویہ جیسے فُضلائے عصر سے فیضیاب ہونے کی وجہ سے انھوں نے علومِ مروّجہ میں کمال حاصل کر لیا۔ کچھ عرصہ دینور کے قاضی رہے۔ پھر بغداد میں درس و تدریس کا پیشہ اختیار کر لیا اور وُہیں ۲۷۲ھ میں وفات پائی۔

ابنِ قتیبہ ادبی دنیا میں بغداد کے نحوی مکتب کے ایک نمائندے متصوّر ہوتے ہیں۔ انشاء پردازی میں وہ جاحظ کے مقلّد تھے اِسی لیے وہ جملوں میں اطناب کا رنگ اختیار کرتے ہیں۔ قاری کی اُکتاہٹ دُور کرنے کے لیے ظرافت کے مضامین کی آمیزش کرتے ہیں۔ عقل و منطق کے سہارے استدلال فرماتے ہیں اور اثنائے عبارت دعائیہ جملے استعمال کرتے ہیں۔ اُنھوں نے ادبُ الکاتب، عیون الاخبار، کتاب معانی الشعر، جیسی تالیفات سپُردِ قلم فرمائیں جو نحو و ادب میں ایک خاص مقام رکھتی ہیں۔

فنِ تاریخ میں ایک ان کی تالیف کتاب المعارف ہے جو عام تاریخی معلومات کا مخزن ہے۔ لیکن ان کی تالیف "الامامۃ والسیاسۃ" نے زیادہ شہرت پائی۔ اس کتاب میں فاضل مؤلف نے بڑی وضاحت اور خوبی سے یہ بیان کیا ہے کہ اسلامی سلطنت کی زمامِ اختیار کیونکر ایک فرمانروا سے دُوسرے فرمانروا کی طرف منتقل ہوتی ہے اور پھر کیونکر اقتدار کی چابیاں ایک خانوادہ دُوسرے خانوادے کو سپُرد کرتا ہے۔

اس تالیف کی سب سے نمایاں خوبی حریّتِ فکر ہے۔ ابن قتیبہ عباسی دَور کا مورّخ ہے لیکن وہ عمُر بن عبدالعزیز کی تعریف میں رطب اللسان ہے۔ اسی طرح وہ اُموی خلیفہ ہشام بن عبدالملک کی توصیف میں زمزمہ سنج ہے جسے وُہ تاریخ بنُوامیہ کی حکومت کا سب سے بڑا ستون قرار دیتا ہے۔ اس کے عدل و انصاف اس کے نظم و نسق اور اس کی رعایا پروری کی وہ مثالیں بیان کرتے ہوئے عباسی خلفاء کی ناراضی کو خاطر میں

نہیں لاتا۔

ایک نکتے کی بات اُنھوں نے عمر بن عبدالعزیز اور ہشام بن عبدالملک دونوں کا موازنہ کرتے ہُوئے یہ لکھی ہے کہ عُمر بن عبدالعزیز بیت المال کی رقوم خرچ کرنے میں حد درجہ محتاط تھے۔ اور انھوں نے اپنے خاندان کو اس امانت سے پھوٹی کوڑی بھی نہ لینے دی۔ جبکہ ہشام اتنا فضول خرچ تھا کہ اس کے مرنے کے بعد اس کے کفن کا سرمایہ بھی خزانے میں موجود نہ تھا[1]۔ ابن قتیبہ ایک بلند پایہ ادیب اور قادر الکلام مصنّف ہیں۔ اس لیے ان کی تالیف حد درجہ دلچسپ ہے۔ چنانچہ طبری کی نسبت اُن کے تاریخی بیانات، ان کی تالیف کے سامنے پھیکے معلوم ہوتے ہیں۔ کہیں کہیں تو مؤثر پیرایہ بیان سے فاضل مؤلف نے اس دَور کی کمال عمدگی سے ایسی تصویر کھینچ دی ہے کہ شاید و باید اُس کی پورے تاریخی ادب میں مثال ملے۔

ابن قتیبہ کی تالیف الامامۃ والسیاسۃ کے بارے میں بعض محققین کا یہ خیال ہے کہ اُس کے چند حصّے الحاقی ہیں۔ اور بعض یہ رائے رکھتے ہیں کہ یہ کتاب ہی ابن قتیبہ کی طرف غلط منسوب کی گئی ہے۔ مثلاً۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی خلافت و ملوکیّت کے ضمیمہ میں صفحہ ۳۱۱ پر لکھتے ہیں:۔

"رہی اس کی کتاب الامامۃ والسیاسۃ، اس کے متعلق کسی نے بھی یقین سے نہیں کہا کہ وُہ ابن قتیبہ کی نہیں ہے۔ صرف شک ظاہر کیا جاتا ہے۔ کیونکہ اس میں بعض روایات ایسی ہیں جو ابن قتیبہ کے علم اور اس کی دُوسری تصنیفات کے ساتھ کوئی مناسبت نہیں رکھتیں۔ میں نے خود یہ پوری کتاب پڑھی ہے اور اس کی چند روایتوں کو میں بھی الحاقی سمجھتا ہوں۔ مگر ان کی بنا پر پوری کتاب کو ردّ کر دینا میرے نزدیک زیادتی ہے۔ اس میں بہت سی کام کی باتیں ہیں اور ان میں کوئی علامت ایسی نہیں پائی جاتی جس کی بنا پر وُہ ناقابلِ قبول ہوں"۔

ادھر جلیل محب الدین خطیب مصری نے اس کتاب کو کسی دُوسرے مؤلف کی کتاب قرار دیا ہے اور دلیل یہ پیش کی ہے کہ الامامۃ والسیاسۃ کا مؤلف اکثر و بیشتر علمائے مصر کے دو عالموں سے روایت کرتا ہے۔ حالانکہ ابن قتیبہ کبھی مصر نہ گئے اور نہ انھوں نے ان دو عالموں سے استفادہ کیا ہے۔ بہرحال یہ ایک نزاعی

---

[1] مقدمہ تاریخ ادبیاتِ عرب از ایچ اے آر گب، مترجم سید محمد اولاد علی گیلانی

بحث ہے۔ جسے ہم طول نہیں دینا چاہتے۔ آخر میں ہم یہ عرض کریں گے کہ ابن قتیبہ کی کسی تصنیف پر شبہ تو کیا جا سکتا ہے لیکن ان کی ثقاہت اور جلالت شان کے بارے میں بدگمانی نہیں کی جا سکتی۔ علامہ ابن کثیر ان کے بارے میں فرماتے ہیں۔" وہ ثقہ تھے اور صاحب فضل و شرف تھے۔"

ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں۔" وہ نہایت راستبازانسان تھے۔"

خطیب بغدادی انہیں ثقہ، قابلِ اعتبار، دیندار اور فاضل بزرگ قرار دیتے ہیں۔

ابنِ حزم فرماتے ہیں کہ" وہ اپنے دین اور علم میں بھروسے کے قابل انسان تھے۔"

محقق المستلفی کا خیال ہے" کہ ابن قتیبہ ثقہ تھے اور اہل سنت والجماعت کے مسلک پر عامل رہے۔"

ابن الواضح یعقوبی

احمد بن ابی یعقوب بن واضح الیعقوبی تیسری صدی ہجری کے نامور مورخ اور جغرافیہ نویس تھے۔ ان کے جد امجد (دادا) المنصور عباسی خلیفہ کے زر خرید غلام تھے۔ ابتداً یعقوبی طاہری خاندان کی ملازمت میں رہے۔ جن کے کارناموں پر انہوں نے ایک تالیف سپرد قلم کی ہے۔ اسی زمانے میں انہوں نے اپنی تالیف کتاب "تاریخ الکبیر مرتب کی۔ طاہری خاندان کے زوال کے بعد وہ مصر تشریف لے گئے۔ جہاں انہوں نے اپنی جغرافیائی تصنیف "کتاب اسماء البلدان" لکھی۔ اور وہیں ۲۷۸ھ میں وفات پائی۔ ان کی دو اور تالیفات ہیں جو نسبتاً غیر معروف ہیں ایک کتاب فی اخبار الامم السلفیہ دوسری کتاب مشکلات الناس لزمانہم۔ اکثر مورخین لکھتے ہیں کہ یعقوبی امامیہ معتدل موسوی فرقے کے معتقدات رکھتا تھا۔ جو اہل تشیع کی ایک شاخ ہے۔ تاہم اس کی تالیفات کافی حد تک فرقہ وارانہ تعصب کی آلودگیوں سے پاک ہیں۔ گرچہ علامہ موصوف کا شیعی میلان ظاہر و باہر ہے۔ اسی طرح معتزلہ کے بارے میں بھی ان کا رویہ نمایاں طور پر ہمدردانہ ہے۔

ابن الواضح یعقوبی کے ہمعصر ابو حنیفہ دینوری نے بھی ایک کتاب "تاریخ عالم" لکھی تھی۔ لیکن وہ ۲۱۸ھ (معتصم باللہ کے زمانے) تک نقطہ اختتام پر پہنچ جاتی ہے۔ جبکہ یعقوبی کی تاریخ عالم (کتاب التاریخ الکبیر) کا سلسلۂ سخن ۲۵۹ھ تک دراز ہو جاتا ہے۔

کتاب التاریخ الکبیر مرتبہ ابن الواضح یعقوبی دو اجزا پر مشتمل ہے۔ الجزءُ الاول آدمؑ سے لیکر مسیحؑ تک انبیائے بنی اسرائیل کے مقدس حالات سے شروع ہوتا ہے۔ پھر شام، بابل، آشوریا اور ہندوستان کے سلاطین کا تذکرہ ہے۔ یونان کے ساٹھ عظیم فلاسفہ کے سوانح اور فلسفیانہ افکار کا خلاصہ بڑے سلیقے سے پیش کیا گیا ہے۔ اسکندر اعظم کے عہد کا طائرانہ جائزہ لیا گیا ہے۔ بازنطینی اور ایرانی حکومتوں کا اجمالی ذکر ہے۔ چینی اور مصر، بربر، سوڈان، شام، یمن اور عرب کے دوسرے علاقوں کے فرمانرواؤں کے حالات کا بیان ہے۔ آخر میں حضرت اسماعیلؑ بن ابراہیم کی اولاد پر

پچاس صفحات لکھے گئے ہیں۔ جس سے عربوں کے عقاید، رسوم، تجارتی منڈیوں، اور معاشرتی زندگی کی صحیح تصویر نگاہوں کے سامنے آجاتی ہے۔ یہ ایک عجیب بات ہے کہ طبری اور بلاذری کے اسلوب تاریخ نگاری سے ہٹ کر وہ پہلی جلد میں کسی خبر کی اسناد یا سلسلۂ روایت کو سرے سے بیان نہیں کرتا۔ اور نہ ہی اپنے سرمایہ علم کے ماخذوں کے حوالے درج کرتا ہے۔ الجزء الثانی۔ جس کی ضخامت پہلی جلد سے دوگنی ہے۔ حضور سرورِ کائنات فخرِ موجودات کی ولادت باسعادت اور سوانح کے ذکرِ جمیل سے شروع ہوتا ہے۔ خلفائے اربعہ، بنوامیہ، اور بنوعباس کی عہد بہ عہد تاریخ بیان کرتے کرتے یہ بلند پایہ تالیف عباسی خلیفہ احمد المعتمد (۲۵۹ھ) کے حالات پر اختتام پذیر ہو جاتی ہے۔ فاضل مؤلف نے آئمہ اہلِ بیت اطہار اور آلِ ابی طالب کے سوانح بیان کرنے میں غیر معمولی کاوش کی ہے۔ پہلی جلد کے اسلوب سے ہٹ کر اپنی (دوسری جلد میں (خصوصاً اس کے دیباچے میں) یعقوبی اپنی اسناد اور حوالے بیان کرتا ہے۔ جن میں اسحاق بن سلیمان، ابو بکر بختری، عبان بن عمان، عمر الواقدی، ابو ملک بن ہشام، حاتم بن عدی، محمد بن موسیٰ خوارزمی کے اسماء خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اس دیباچے سے فاضل مؤلف کے دائرۂ تحقیق کی وسعت کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

ابن الواضح یعقوبی اپنی تاریخ کو زیادہ طول نہیں دینا چاہتے۔ اسی لیے وہ راویوں کے طویل بیانات کو حذف کر دیتے ہیں اور اشعار کو بھی نظر انداز کر دیتے ہیں۔ البتہ انہیں خطبوں اور اخلاقی اقوال میں گہری دلچسپی ہے۔ جنہیں وہ جابجا مختصر اقتباسات کی صورت میں ثبت کر دیتے ہیں۔

ابن الواضح یعقوبی کو علم سیّارگان میں خصوصی درک حاصل تھا۔ چنانچہ وہ ہر عہدِ حکومت کے آغاز میں بروج وکواکب کا صحیح نقشہ پیش کرتے ہیں جس سے علم نجوم کے ساتھ اُن کا غیر معمولی شغف ثابت ہوتا ہے۔ تقریباً ہر باب میں یعقوبی بادشاہ کے ایسے مقربوں اور مصاحبوں کے حالات ضرور درج کرتے ہیں جن کی ہمعصر بادشاہوں تک رسائی تھی اور اس طرح وہ ملکی سیاست کے در و بست پر حاوی تھے۔ مثلاً امیر الحج، امیر الجیش اور قاضی القضاۃ وغیرہ۔

علم جغرافیہ کے موضوع پر یعقوبی نے مصر میں کتاب اسماء البلدان لکھی جو اس وقت کے مسلمانوں کا دوسرا بڑا علمی مرکز تھا۔ یہ تالیف بیش قیمت جغرافیائی معلومات کا خزینہ ہے۔ نیز بغداد اور سامرا جیسے دارالسلطنتوں کے چشم دید حالات جو اس میں مذکور ہیں خاص طور پر قابلِ قدر ہیں۔ جغرافیائی

معلومات کے حصول کے لیے ابن الواضح یعقوبی دیار و امصار کی خاک چھانتے پھرے۔ مصر، آرمینیا شام، ممالکِ غرب، خصوصاً مراکش اور سپین تک گئے۔ مشرق کی سمت وہ ہندوستان تک آئے اور یہ تمام سفر اُن کے تحصیلِ علم کے لیے تھے۔ جیسا کہ فاضل مؤرخ اپنی تالیف کتاب البلدان کے دیباچے میں لکھتے ہیں۔

"اوائل عمر سے مجھے اس امر میں دلچسپی تھی کہ لوگوں کے معاشرتی احوال سے واقفیت حاصل کروں اور اُنکی عادات و اطوار، آداب و رسوم، علماء فضلا، اُمراء و سلاطین، مملکت کے ذرائع آمدنی اور مختلف مقامات کے درمیانی فاصلوں کے بارے میں وقوف و آگہی حاصل کروں"۔ یعقوبی کے ان چند جملوں سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں کے ہاں دوسری اقوام کی نسبت ابتدا سے ہی تاریخ و جغرافیہ کا کتنا وسیع تر اور جامع تر تصور تھا — — — — — — بلا شبہ قارئین کو ابن الواضح یعقوبی کی تالیف التاریخ الکبیر کے اکثر ابواب تشنہ و نا تمام معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن مارگولیتھ نے اس بارے میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ فاضل مؤلف نے یہ کتاب علم تاریخ کے ان طلباء کے لیے ترتیب دی ہے جو اس فن کی گہرائیوں میں اُترنے کا قصد نہیں رکھتے بلکہ اُسے صرف تھوڑا بہت جاننے کا ذوق و شوق رکھتے ہیں۔

بُروکلمان کی تحقیق یہ ہے کہ اگرچہ ابن الواضح یعقوبی نے اپنی تاریخ شیعی نقطۂ نظر سے لکھی ہے۔ لیکن اُس نے حقائق کی تصویر کو مسخ کرنے سے احتراز کیا ہے۔ جو اُس کی مؤرخانہ عظمت کی روشن دلیل ہے۔

امام طبری

امام ابوجعفر ابن جریر طبری ۲۲۵ھ میں طبرستان میں پیدا ہوئے۔ سات برس کی عمر میں قرآن مجید حفظ کر لیا۔ رَے، کوفہ، بغداد اور مصر جیسے اہم مراکز علم میں جا کر علومِ مروّجہ کی تحصیل و تکمیل کی۔ امام موصوف بہت قانع انسان تھے۔ اور اُمراء و رؤسا کی امداد ہرگز قبول نہ فرماتے تھے۔ ان کو حکام و سلاطین کی طرف سے بارہا سرکاری عُہدوں اور مناصب کی پیش کش کی گئی۔ لیکن انھوں نے پائے استغنا سے ان عہدوں کو ٹھکرا دیا۔ اور تصنیف و تالیف کو اپنا مشغلہ بنایا۔ شاید ہی کوئی شعبۂ علم ایسا ہو جس پر علامہ ممدُوح نے قلم نہ اٹھایا ہو۔ تفسیر، تاریخ، فقہ، ادب، نحو، شاعری، اخلاقیات، طب، ریاضی یہ سارے علوم و فنون اُن کے حلقہ بگوش نظر آتے ہیں۔ دارالمعارف مصر سے جو طبری کی تاریخ شائع ہوئی ہے اُس کے مرتب نے آپ کی چھبیس تصانیف کی فہرست پیش کی ہے۔ جو مختلف النوع علوم و فنون پر حاوی ہیں۔ محققین کا قیاس ہے کہ امام طبری نے چالیس سال کی عمر سے لے کر وفات تک اوسطاً چالیس صفحات روزانہ تحریر فرمائے۔

امام موصوف کی فنِ تاریخ میں شہرہ آفاق تصنیف "تاریخ الرسل والملوک" ہے۔ یہ کتاب جو فاضل مؤلف نے آٹھ برس کی محنتِ شاقہ سے قلم بند فرمائی، مسلمانوں کی تاریخ نویسی کا قابلِ فخر شہ کار ہے۔ تاریخ طبری پیدائش عالم سے لے کر ۳۰۲ھ تک کے واقعات پر مشتمل ہے۔ کتاب کی تمہید میں انبیائے سابقین اور مختلف قوموں کے نامور سلاطین، خصوصاً ساسانی دَور کے ملوک کا مفصل تذکرہ ہے۔ اس قابلِ قدر تصنیف کی چند خصوصیات درجِ ذیل ہیں۔

۱۔ اس تالیف کا نمایاں وصف غیر جانبداری ہے۔ جس سے کام لیتے ہوئے، ہر قسم کے جذبات و تعصبات سے بالاتر ہو کر مختلف قوموں اور سلطنتوں کے حالات و واقعات کو قلم بند کیا گیا ہے۔ بلاشبہ یہ وُہ خوبی ہے جو کسی مؤرخ کی فکری عظمت کی آئینہ دار ہوتی ہے۔

۲ - اس کتاب کی دوسری خوبی یہ ہے کہ اس کتاب میں واقعات کو بیان کرتے وقت، ربط، ترتیب تسلسل کا خاص اہتمام کیا گیا ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ ہر واقعہ سے متعلق مختلف روایات کو جمع کر دیا گیا ہے۔ البتہ تنقید و تبصرے کا کام قارئین پر چھوڑ دیا گیا ہے۔

۳ - چونکہ علامہ طبری محدّث تھے۔ اس لیے انہوں نے تاریخ لکھتے ہوئے محدّثین کے انداز تحقیق و روایت کو اپنایا ہے اور علامہ موصوف نے نہ صرف ایک ہی واقعہ سے متعلق مختلف روایات کو ان کے راویوں کے نام سے پیش کر دیا ہے۔ بلکہ ہر واقعہ کے سلسلہ اسناد کو اس شخص تک پہنچایا ہے۔ جو خود اس واقعہ کا عینی شاہد ہو

۴ - علامہ ممدوح نے تیسری صدی ہجری میں سنین کے لحاظ سے واقعات کو مرتب کیا ہے۔ جبکہ یورپ میں سولھویں صدی عیسوی تک ماہ و سنین لکھنے کا اُن کے مؤرخین نے کوئی اہتمام نہ کیا۔ اس طرح علامہ طبری نے صدیوں پہلے وہ کارنامہ انجام دیا جس پر مسلمان بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں۔

خلاصہ کلام یہ کہ "تاریخ الرسل والملوک" اسلام کی تین صدیوں کے متعلق چشم دید حالات اور مصدقہ روایات کا ایسا بیش بہا ذخیرہ ہے جو عربی ادب میں بے مثال ہے۔ لاریب علامہ طبری جزئیات نگاری، صحتِ بیان، تحقیق و تدقیق، تبحرِ علمی اور زورِ بیان میں اپنے پیش رو مورخین و مؤلفین پر سبقت لے گئے۔ زمانے کی دستبرد سے اس عظیم تاریخ کے اوراق پریشان ہو گئے تھے۔ لیکن لائیڈن یونیورسٹی کے پروفیسر ڈی خویرے نے ان منتشر اوراق کو نئی ترتیب دی اور ایک نہایت عمدہ ایڈیشن شائع کر دیا۔ اس بلند پایہ تالیف کے عربی و فارسی میں بکثرت تراجم ہوئے، اور ملخص لکھے گئے۔ فارسی زبان سے اس کا فرانسیسی زبان میں ترجمہ ہوا۔ تاریخ العرب کے مصنف موسیو سدیو کی روایت کے مطابق اس کا لاطینی ترجمہ جرجس نصرانی نے کیا تھا۔

علامہ طبری کے معاصرین ان کی مؤرخانہ قابلیت کے معترف تھے۔ اور بعد کے اکثر و بیشتر مؤرخین نے ان کی قابلِ قدر تالیف سے استفادہ کیا ہے۔ چنانچہ امام الائمہ ابن خزیمہ فرماتے ہیں "روئے زمین پر محمد ابنِ جریر طبری سے زیادہ (تاریخ و تفسیر کا) عالم میرے علم میں نہیں آیا۔ علامہ ذہبی تذکرۃ الحفاظ میں اُنہیں اربابِ علم و فضل کا پیشوا اور امام قرار دیتے ہیں۔ حافظ ابن اثیر کتاب الکامل میں ان کے صحیح العقیدہ

اور کامل الفن ہونے پر زور دیتے ہیں۔ یاقوت حموی کے نزدیک علامہ طبری وسیع العلم، بیدار مغز، اور ذو فنون عالم ہونے میں بے مثل تھے۔ جدید محققین میں سے ڈی خویہ لکھتا ہے۔ طبری کے فن تاریخ میں کارناموں کے سامنے تمام مؤرخین کی کاوشیں ہیچ ہیں اور مارگولیتھ کا خیال ہے کہ جو مقام ومرتبہ امام بخاری کو علم حدیث میں حاصل ہے۔ وہی رُتبہ امام طبری کو علم تاریخ میں نصیب ہوا۔

آخر میں یہ بیان کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ آج سے تقریباً ایک ہزار سال پیشتر علامہ ابن جریر طبری نے از خود وقائع نویسی اور تاریخ نگاری کا کتنا معیار بلند کیا تھا جس کا انہوں نے التزام فرمایا۔ اس بارے میں اپنی مشہور زمانہ "تاریخ" کے دیباچے میں فاضل مؤلف رقم طراز ہیں۔

"میری تصنیف کا مطالعہ کرنے والوں کو یہ امر اچھی طرح معلوم ہونا چاہیئے کہ میں نے اس کتاب میں جن واقعات کا ذکر کیا ہے اور جن کی نگارش کا بیڑا اٹھایا ہے ان کے متعلق میرا بھروسہ صرف ان معلومات پر ہوگا جن کا میں اس کتاب میں ذکر کروں گا اور جن کی سند واقعات کو بیان کرنے والوں تک پہنچاؤں گا۔ لیکن عقلی استدلال اور ذہنی قیاس سے جو نتائج پیدا کیے جاتے ہیں ان کے ذکر سے حتی الوسع احتراز کروں گا۔ کیونکہ گذرے ہوئے لوگوں کے واقعات اور حوادث جو ماضی میں پیش آئے۔ ظاہر ہے کہ جن لوگوں نے ان کا مشاہدہ نہیں کیا، ان تک ان کی خبریں براہ راست نہیں پہنچی ہیں اور نہ انہوں نے ان کا زمانہ پایا ہے۔ ان حوادث کے متعلق نقل کرنے والوں نے جو نقل کیا ہو، ان کے علم کی یہی صورت ہے۔ نہ کہ عقلی قیاس آرائیوں اور فکری جولانیوں کی راہ سے ان کا علم حاصل کیا جاتے۔" تاریخی روایات کے بارے میں جذبہ داری کا یہی احساس تھا جو تمام مسلمان مؤرخین میں ہر زمانے میں بیدار رہا ہے اور انہوں نے ہر قسم کی ذمہ داریوں سے الگ ہو کر اپنا فرض منصبی سرانجام دیا ہے۔

مشاجراتِ صحابہ اور طبری:۔

اس مبحث کے آخر میں ہم مشاجراتِ صحابہ کے متعلق طبری کے محتاط اندازِ نگارش کے بارے میں چند سطور زینتِ قرطاس کرنا چاہتے ہیں۔ اصحاب رسول اللہ کے نزاعات اور اختلافات کے عنوانات پر

امام ابن جریر طبری نے بڑے محتاط اور ذمہ دارانہ انداز سے بحث کی ہے اسی لیے ابن الاثیر اپنی تاریخ "الکامل" کے مقدمہ میں لکھتے ہیں کہ میں نے اصحابِ رسول اللہ کے مشاجرات کے معاملہ میں دوسرے تمام مؤرخین کی نسبت امام ابنِ جریر طبری پر زیادہ اعتماد کیا ہے۔ نیز علامہ ابن خلدون بھی جنگِ جمل کے واقعات کے آخر میں رقم طراز ہیں۔

"میں نے واقعات کا یہ ملخص دوسرے مؤرخین کو چھوڑ کر طبری کی تاریخ سے اخذ و مرتب کیا ہے کیونکہ وہ زیادہ قابلِ اعتماد ہیں اور ان کی تحریر ان خامیوں سے پاک ہے جو ابن قتیبہ یا دوسرے مؤرخین کی کتابوں میں پائی جاتی ہیں"۔ لیکن ہم یہاں یہ اضافہ کرنا چاہتے ہیں کہ مشاجراتِ صحابہ کے ضمن میں امام ابن جریر طبری نے بعض اوقات ایسی متضاد و متناقض روایات جمع کر دی ہیں جن سے محققین نہ سہی عام شائقین تاریخ مغالطوں میں پڑ سکتے ہیں۔ پس ایسے باذوق قارئین تاریخ کو ہم ابنِ کثیر کی تاریخ البدایہ والنہایہ کے مطالعہ کا مشورہ دیں گے۔ جو اس موضوع پر حرفِ آخر کا درجہ رکھتی ہے۔

المسعُودی

چوتھی صدی ہجری کے بلند پایہ مؤرخ، عظیم سیاح، اور نامور جغرافیہ دان ابوالحسن علی بن الحسین بن علی المسعودی، ہیں جنہیں مغربی مصنفین سرزمین یونان کے مؤرخ ہیرودوتس کا مثیل قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ ان کا علمی رتبہ ہیرودوتس سے کہیں افضل ہے۔ علامہ موصوف بغداد میں پیدا ہوئے۔ ان کا سلسلہ نسب صحابیِ رسولؐ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے جا ملتا ہے۔ اس لیے اگر علامہ مسعودی بہت سے وہبی و کسبی علوم کے جامع ہیں تو کچھ تعجب نہیں۔ بلکہ یہ کمالات تو اُن کی آبائی میراث ہیں!

علامہ مسعودی نے تعلیم سے فارغ ہو کر دُور دراز ممالک کے سفر کیے اور مختلف قوموں اور ملکوں کے جغرافیائی۔ تاریخی، معاشرتی اور مذہبی حالات کا بچشم خود مطالعہ کیا۔ آپ ہندوستان میں مُلتان و منصورہ سے ہوتے ہُوئے کھمبایت اور سیلون تک پہنچے۔ کچھ عرصہ دکن میں بھی قیام فرمایا۔ یہاں تک کہ ایک چینی قافلے کے ہمراہ چین کی سرحد تک جا پہنچے۔ وہاں سے لوٹ کر آئے تو زنجبار، عمّان، فلسطین، انطاکیہ اور شام کے علاقوں کی سیاحت کر کے جہاں کشائی اور جہاں گردی کی روایات تازہ کر دیں۔[1] ان سفروں کی افادیت پر بحث کرتے ہُوئے علامہ ممدوح رقم طراز ہیں۔

"جو شخص اپنے گھر سے کبھی باہر نہ نکلا ہو بلکہ اُتنے ہی مبلغ علم پر قانع رہے جو اُسے خود اپنے ملک کی تاریخ کے بارے میں حاصل ہو تو وہ اس شخص کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ جس نے اپنی تمام عمر حضر کی بجائے سفر میں بسر کی ہو جس نے اپنی زندگی کے شب و روز بادیہ نوردیوں اور کشور گردیوں میں گذارے ہوں اور جس نے ہر طرح کی حیرت افزا معلومات اور گرانمایہ اطلاعات بہم پہنچائی ہوں۔ علامہ مسعودی

---

[1] ان سفروں کی پوری تفصیل مولانا عبداللہ العادی نے "تنبیہ واشراف" کے دیباچے میں نقل کی ہے۔

کے اسفار کی غرض و غایت جلبِ منفعت نہ تھی بلکہ ان کے پیشِ نظر یہ تھا کہ ہر ملک کی خصوصیات کا بنظرِ امعان مطالعہ کیا جائے۔ وہاں کے آثارِ قدیمہ، تاریخی حالات، اور تہذیب و تمدّن کے بارے میں ضرور معلومات فراہم کی جائیں اور پھر اُنہیں شائقینِ علم کے سامنے پیش کر دیا جائے۔

المسعودی ذو فنون، اور جامع الکمالات عالم تھے۔ لسانیات، فقہ، ادب، قانون، حکمت، سیاست اور اخلاق کے متنوع عنوانات پر متعدد مبسوط تالیفات قلم بند فرمائیں۔ لیکن صد افسوس! کہ آپ کی بیشتر تصانیف زمانے کے انقلابات کے ہاتھوں ضائع ہو گئیں۔ تاریخ کے موضوع پر علّامہ ممدوح نے متعدد کتابیں لکھیں۔ جن کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے کہاں کہاں کی سیاحت فرمائی۔ اور پھر کس عرق ریزی سے اپنے مشاہدات کے حاصل کو مرتب کیا۔ علّامہ موصوف نے ۳۴۶ھ میں فسطاط کے مقام پر وفات پائی۔

علم تاریخ کے موضوع پر سب سے زیادہ مفصل کتاب جو المسعودی نے ترتیب دی "اخبار الزمان" کے نام سے مشہور تھی۔ جس میں تاریخ عالم کے واقعات ۳۰۶ھ تک مذکور تھے۔ یہ کتاب تیس ۳۰ جلدوں پر مشتمل تھی۔ اب اس کی صرف ایک جلد دستیاب ہے باقی انتیس ۲۹ جلدیں ناپید ہیں۔ نگار کے علومِ اسلامی نمبر میں نیاز فتح پوری لکھتے ہیں کہ مسعودی نے تاریخ کے موضوع پر ایک کتاب "الاوصاف" بھی لکھی تھی جس میں انہوں نے اپنی مفصل "تاریخ عالم" اخبار الزمان کے اقتباسات اور حوالے دیئے تھے۔ علّامہ مسعودی کی تیسری مشہور تاریخی تصنیف "مروج الذہب و معادن الجواہر" ہے جسے انہوں نے ۳۴۶ھ میں مکمل کیا تھا۔ یہ کتاب اُن کی پہلی دونوں کتابوں کا جامع خلاصہ ہے۔ جس سے مؤلّف کی تاریخی معلومات کی وُسعت اور ذوقِ تحقیق کی ندرت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ دنیا کی اکثر زبانوں میں اس کتاب کے تراجم ہو چکے ہیں۔

اس کتاب میں ۳۳۶ھ تک کے حالات درج ہیں۔ جب کہ بغداد میں خلیفہ المطیع باللہ عباسی کی حکومت تھی۔ فرانسیسی مستشرقین کی کاوش سے اس کا فرانسیسی زبان میں پیرس سے ایک ترجمہ شائع ہو چکا ہے۔ تاریخ کے موضوع پر علّامہ مسعودی کی سب سے اہم کتاب تنبیہہ و اشراف ہے۔ جس کے تین سو صفحات میں عہدِ نبوی سے لے کر عباسی خلیفہ المطیع باللہ (۳۴۵ھ) تک کے حالات کا بیان ہے اور اس کتاب پر "دریا بہ حباب اندر" کی ضرب المثل صادق آتی ہے۔ اختصار و جامعیت اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ خود فاضل مؤلف فرماتے ہیں "اس کتاب سے اتنی غرض ہے کہ تاریخی اُمور پر تھوڑی سی روشنی پڑ سکے۔ تشریح و توضیح

مقصود نہیں"۔ اس تصنیف میں ہر خلیفہ کا نام، کنیت، لقب، حسب و نسب، تاریخ پیدائش اور جائے ولادت، سنِ وفات اور مدفن، کل عمر اور مدتِ خلافت، نیز اخلاق و کردار پر بڑے جامع اشارات درج ہیں۔ پھر ہر خلیفہ کے سکے پر نقش (نقش خاتم) کا ذکر ہے۔ ہر فرمانروا کے حاجب (سیکرٹری) کاتب وزیر، اور قاضیوں کا بیان ہے۔ کہیں کہیں اس دَور کے عربی اشعار سے استفادہ کیا گیا ہے جس سے کتاب بڑی جاذبِ توجہ بن گئی ہے۔ دراصل یہ ایک قسم کے تاریخی نوٹس ہیں جن میں مضامین کا تنوع حیرت انگیز ہے۔ اس تالیف کی ایک نمایاں خوبی یہ ہے کہ اس میں بعض ایسے تاریخی مباحث مل جاتے ہیں جو تاریخ کی مطوّل کتابوں میں بھی شاید و باید ہی مل سکیں۔

چونکہ فاضل مؤرّخ اپنے عصر کے فلسفیانہ افکار اور تنقیدی رجحانات سے کافی حد تک متاثر تھے۔ اس لیے تاریخ کی تمام کتابوں میں واقعات کی چھان بین میں انہوں نے فلسفیانہ درک اور تنقیدی بصیرت سے کام لیا ہے۔ علامہ مسعودی کی اس تالیف کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے طبری یا دیگر معاصر مؤرخین کی طرح سنین وار تاریخ لکھنے کی روش سے ہٹ کر حکمران خاندانوں کے ادوارِ حکومت کی ترتیب کے لحاظ سے تاریخ مرتب کی ہے۔ جو تاریخ نویسی کے میدان میں اُن کی جدّت طرازی کی غمّاز ہے۔ اگرچہ مشرقی ممالک کے بارے میں علامہ طبری کا فراہم کردہ مواد حرفِ آخر تھا۔ مگر مغربی ممالک مثلاً اُمرائے اُندلس کے بارے میں مسعُودی نے پہلی مرتبہ بیش قیمت معلومات پیش کر کے اپنی وسعت نظر کا لوہا منوا لیا۔

اس تالیف کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ کتاب اوّل تا آخر حُسنِ ترتیب کا نادر مُرقّع ہے اور فاضل مؤلف یہ دعوٰی کرنے میں حق بجانب ہیں: "فنِ تاریخ کے کسی مصنف کو ہم نے ایسا نہیں پایا۔ جس نے ہماری طرح اس فن کو حاصل کیا ہو اور ہماری جیسی ترتیب دی ہو۔ جسے دیکھنا ہو سَلف و خَلف کے مصنفین کی تصانیف دیکھ لے۔ جو اس شعبہ (تاریخ) میں مسلّم مانے جاتے ہیں۔ ان کتابوں کا جو شخص مطالعہ کرے گا اور ان کی حقیقت سے آگاہ ہو جائے گا تو پھر اس پر ہمارے کام کی فضیلت روشن ہو گی۔ مطالعۂ کتاب و احاطۂ ابواب کے بعد تو اس کا سمجھنا آسان ہے مگر بغیر اس کے

لہ تنبیہ و اشراف (ترجمہ مولانا عبداللہ العمادی) صفحہ ۲۰۸

دشوار ہے۔[1]

اس تالیف کی آخری خوبی یہ ہے کہ تاریخ نگاری کا پیرایہ حد درجہ دلچسپ اور دلآویز ہے۔[2]

ابن ندیم نے الفہرست میں، یاقوت نے ارشاد الادیب میں اور علامہ السبکی نے طبقات الشافعیہ میں المسعودی کو درجۂ اوّل کے مؤرخین میں شمار کیا ہے۔

ابن خلدون جیسے عظیم مورخ نے اپنی تاریخ کتاب العبر میں جابجا المسعودی کی تاریخی روایات کے حوالے دیئے ہیں اور لکھا ہے کہ انہوں نے اپنے زمانے کے حالات دریافت کرنے اور انہیں سلیقے سے بیان کرنے کی جو کوشش کی ہے وہ دوسرے اہل تحقیق کے لیے قابل تقلید ہے۔

موسیو کاترمیر لکھتا ہے: "جب ہم اس صاحب کمال مؤرخ کی تالیفات پر نظر ڈالیں تو حقیقت میں ان متنوع مضامین کو جن پر اس نے قلم اٹھایا ہے اور جس طرح بڑے بڑے مسائل کو حل کیا ہے، دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ مسعودی نے نہ صرف عربوں کی تمام تاریخی کتب کا مطالعہ کیا ہے بلکہ یونانیوں اور رومیوں کی کتبِ تاریخ سے بھی استفادہ فرمایا ہے"۔ دائرۃ المعارف برطانیہ کا مقالہ نگار علامہ ممدوح کی بے تعصبی کی داد دیتے ہوئے، انہیں یونانیوں کے عظیم مؤرخ ہیرودوتس کا مثیل قرار دیتا ہے۔

پروفیسر نکلسن بھی مقالہ نگار موصوف کا ہم نوا ہے اور مسعودی کی فضیلتِ علمی کا مدّاح ہے۔

پروفیسر گب لکھتا ہے کہ المسعودی کو دعالم اسلام کے مشاہیر مؤرخین میں شمار کیا جانا چاہیئے۔

مزید براں علامہ شبلی نعمانی ابوالحسن علی بن مسعودی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ "اسلام میں آج تک اس کے برابر کوئی وسیع النظر مورّخ پیدا نہیں ہوا۔ وہ دنیا کی اور قوموں کی تواریخ کا بھی بہت بڑا ماہر تھا۔ اس کی تمام تاریخی کتابیں ملتیں تو کسی اور تصنیف کی کچھ حاجت نہ ہوتی"۔

مولوی خدابخش مرحوم کی رائے ہے کہ المسعودی کے وجود سے مسلمانوں میں تاریخ نویسی کے نئے دور کا آغاز ہوا جس میں قدیم روایتی انداز کی جگہ جدید عقلی اور تنقیدی انداز نے لے لی۔

---

[1] تنبیہ و اشراف ترجمہ عبداللہ العمادی صفحہ ۱۱۷

[2] تاریخ ادبیات عربی مولفہ سر ہملٹن گب۔

ابنِ مسکویہ

ابو علی ابن مسکویہ نہ صرف بنو بویہ کے سلاطین کے دور میں ۳۳۰ھ میں پیدا ہوئے بلکہ اِس خانوادے کے تاجداروں کے ندیم خاص رہے اور ایک عظیم فلسفی، باکمال ادیب اور نکتہ رس مورّخ کی حیثیت سے مشہور ہوئے۔ علاّمہ موصوف ابتدائی زندگی میں علمِ کیمیاگری میں منہمک رہے اور اپنی عُمر کا کافی حصّہ، اور اپنی جمع پونجی اسی خبط میں ضائع کر دی۔ جب ابن مسکویہ خالی ہاتھ ہو گئے تو اپنی آزاد فکری کے باوجود خاندان بنو بویہ کے مُلوک و سلاطین کی ملازمت کرنے پر مجبور ہوئے، عضدالدولہ نے اُنہیں شیراز کے عظیم الشان کتب خانے کا ناظم مقرر کیا۔ اسی زمانے میں اُنہیں علم وادب سے گہرا شغف پیدا ہوا۔ عضدالدولہ کی وفات کے بعد ابن مسکویہ نامور وزیر ابن عمید کے کتب خانے کے مہتمم مامور ہوئے۔ بنو بویہ کے سلاطین میں سے عضدوالدولہ، صمصام الدولہ اور بہاء الدولہ جیسے تاجداروں کے درباروں میں انہوں نے بڑے اعزاز و اکرام کی زندگی بسر کی۔ اور آخری عمر کا حصّہ مطالعہ، تحقیق اور تصنیف کے لیے وقف کر دیا۔

ابن مسکویہ ذو فنون عالم تھے۔ انہوں نے طب، منطق، ریاضیات، طبیعات، الٰہیات، علمِ حساب اور کیمیا گری جیسے متنوّع علوم و فنون پر تالیفات سپُردِ قلم فرمائی ہیں۔ محمد لطفی جمعہ نے اپنی تصنیف "فلاسفہ اسلام" میں اس عظیم فلسفی کی دس کتابوں کی فہرست نقل کی ہے۔

ابنِ مسکویہ میں شعر و ادب کا فطری ملکہ تھا۔ اگرچہ شعر گوئی میں فاضل فیلسوف کوئی بڑا مقام حاصل نہ کر سکے۔ لیکن سہل و سلیس نثر لکھنے میں انہیں بڑا کمال حاصل تھا۔ شاید یہ جوہر بوعلی سینا جیسے عظیم طبیب اور بدیع الزمان ہمدانی جیسے کامل ادیب سے دوستی کے باعث چمک اٹھا ہو۔ ابن مسکویہ عربی زبان پر غیر معمولی دسترس رکھتے تھے۔ جو اس وقت کی علمی زبان تھی اور فارسی میں بھی یدِ طولیٰ رکھتے تھے۔ جو آلِ بویہ کی سرکاری اور دفتری زبان تھی۔

ابن مسکویہ نے تجارب الامم فی تعاقب الھمم عوام کے لیے نہیں بلکہ خواص اور اہلِ نظر کے لیے لکھی ہے۔ اس کے مخاطب وہ لوگ ہیں جو با اختیار حاکم ہیں یا مدبرین سیاست ہیں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں۔ میں نے اسی لیے یہ کتاب مرتب کی اور اس کا نام تجارب الامم رکھا کہ اس سے زیادہ تر وہ لوگ فائدہ حاصل کر سکتے ہیں۔ جن کو دنیوی امور کا تجربہ ہے۔ مثلاً اُمراء، فوجی افسر، مدبرین سیاست وغیرہ وغیرہ۔ ابن مسکویہ نے طوفانِ نوح سے پہلے کی روایات کو اپنی تالیف میں سرے سے کوئی جگہ نہیں دی۔ کیونکہ ان کے نزدیک یہ غیر تاریخی دَور ہے۔ جس کے بارے میں روایات قابلِ اعتماد ذرائع سے ہم تک نہیں پہنچتیں۔ دوسرے یہ کہ عملی زندگی میں ان سے کوئی خاص فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔

تجارب الامم[۱] میں ابن مسکویہ نے تاریخی روایات کے انبار لگانے کی کوشش نہیں کی۔ بلکہ فلسفیانہ بصیرت سے کام لیتے ہوئے صرف ان منتخب واقعات کا ملخص پیش کیا ہے جو کسی قوم کے عروج و زوال کا نقشہ پیش کرتے ہیں۔ فاضل فلسفی اربابِ سلطنت کو یہ سمجھانا چاہتے ہیں کہ وہ میدانِ سیاست میں ایسی معتدل راہ اختیار کریں جو نہ صرف ملک و ملت کو عروج و کامرانی سے ہم کنار کر دے اور سلطنت کو زوال و ادبار سے محفوظ کر دے۔ اس تالیف میں تاریخی واقعات کا بیان طوفانِ نوح سے شروع ہوتا ہے اور ۳۶۹ھ تک کے واقعات مذکور ہیں۔ علامہ موصوف نے طبری کی تاریخ الرسل والملوک، محمد بن یحییٰ الصولی کی تالیف ورقتہ، اور ثابت ابن سنان کی وقائع سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔ اپنے معاصرین میں سے ابوالفضل محمد بن حسین بن عمید سے متعدد روایات نقل کی ہیں کیونکہ وہ ان کے نزدیک قابلِ اعتماد راوی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ان کی تالیف کا آخری حصہ ابواسحاق ابراہیم کی کتاب "التاجی" کا ملخص ہے۔ لیکن چونکہ مؤخر الذکر تالیف معدوم ہے اس لیے اس خیال کی نہ تصدیق کی جا سکتی ہے اور نہ تکذیب۔ اور اس دَور سے متعلق مواد حاصل کرنے کے لیے ہمیں بہرحال ابن مسکویہ کا مرہونِ منت ہونا پڑتا ہے۔

ابن مسکویہ وہ پہلے نکتہ رس اور نکتہ فہم مؤرخ ہیں جنھوں نے محض واقعات نگاری کی بجائے حقائق

---

[۱] اس کتاب کا ایک قلمی نسخہ استنبول کی لائبریری "ایا صوفیہ" میں محفوظ ہے مگر ابھی تک اس کا صرف وہ حصہ زیورِ طباعت سے آراستہ ہوا ہے۔ جس میں چوتھی صدی کے واقعات مندرج ہیں۔

کے اسباب و علل کا کھوج لگانے میں اتنی محنت کی کہ تاریخ کو ایک سائینٹفک علم بنا دیا۔ اپنی تالیف کے مقدمے میں فرماتے ہیں: " قوموں کے حالات اور بادشاہوں کے تذکرے میری نظر سے گذرے اور میں نے شہروں کے حالات پڑھے۔ تو ایسی باتیں نظر آئیں جن سے ملتے جلتے واقعات، اکثر ہمیں پیش آتے ہیں اور آئندہ بھی اس قسم کے واقعات دہرائے جانے کی توقع کی جاسکتی ہے ۔ فاضل محقق کا نقطۂ نظریہ ہے کہ "تاریخ اپنے آپ کو دہراتی رہتی ہے"۔ اس لیے ماضی کے واقعات کے صحیح تجزیئے سے مستقبل کے واقعات کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے اور وقت آنے پر مفید قدم اٹھایا جاسکتا ہے۔ خصوصاً اسلاف کے تجربوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سیاست کی ایسی راہ اختیار کی جاسکتی ہے جس سے کوئی سلطنت زوال سے محفوظ رہ سکے۔ ابن مسکویہ مورخین اسلام پر یہ امتیاز بھی حاصل ہے کہ اُنھوں نے پہلی مرتبہ ایسے تنقیدی اصولوں کی رعایت برتی کہ تاریخ قصے کہانیوں کی سطح سے بلند ہوکر، تدبیرِ سیاست اور فنِ اخلاق پر حاوی ہوگئی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تالیف میں رطب و یابس روایات کی بھرمار کی جگہ صرف ایسے مستند اور معتبر واقعات ملتے ہیں جو عقل و شعور کی کسوٹی پر پورے اُترتے ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں۔

"میں نے دیکھا کہ تاریخی واقعات اور قصے و خرافات باہم گڈمڈ ہوگئے ہیں، حالانکہ قصّوں سے اس کے سوا اور کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا کہ اُن کو سُن کر نیند آئے اور ان کی اعجوبگی سے دلچسپی لی جائے۔"

بلاشبہ ابن مسکویہ نے طبری، ابن کامل اثیر محمد یحییٰ الصولی اور ثابت ابن سنان جیسے مؤرخین اور فاضلین کا لیق سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔ لیکن واقعات کی چھان پھٹک اور حقائق کو صحیح پس منظر میں رکھ کر سمجھنے میں وہ اپنے پیشرو مؤرخین پر گوئے سبقت لے گئے۔ خصوصاً وہ ابواب جو آل بویہہ کے دورِ حکومت سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے بیان میں بڑی احتیاط سے کام لیا گیا ہے۔ بلاشبہ یہی واقعات اُن کی تالیف کا اہم ترین حصہ ہیں۔ کیونکہ تاریخ کے یہ واقعات اُن کے چشم دید ہیں۔ چونکہ اُن کی آلِ بویہہ کے درباروں میں رسائی اور پذیرائی تھی اس لیے بہت سا مواد جو وہ براہ راست حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے وہ کسی دوسرے معاصر مؤرخ کو دستیاب نہ ہوسکتا تھا۔ تجارب الامم کو جس معروضی "OBJECTIVE" انداز میں فاضل مؤلف نے مرتب کیا ہے۔

اس کے بارے میں مغربی محقق مارگولیتھ اپنے خطبات میں لکھتا ہے کہ "صرف ایک صفحے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ابن مسکویہ مسلمان ہے۔ ورنہ وہ حقائق و واقعات کو ایسے غیر جانبدارانہ انداز سے پیش کرتا ہے کہ اس کے ذاتی رجحان و مسلک کا کہیں پتہ نہیں چلتا" اس طرح تجارب الامم کو علمی بے تعصبی کا شہ کار کہا جا سکتا ہے۔ ابن مسکویہ کی تالیف کی سب سے بڑی خصوصیت علامہ ممدوح کی حریتِ فکر اور حق گوئی ہے۔ اگرچہ علامہ موصوف بویہ کے نمک خوار ہیں لیکن وہ ان کی غلطیوں کی پردہ پوشی کرنے کی بجائے اُن کی خامیوں پر کڑی نکتہ چینی کرتے ہیں۔ چنانچہ آلِ بویہ خانوادے کے بانیٔ اوّل عمادالدولہ کے رویّے کا شکوہ کرتے ہیں اور معزالدولہ کے باغیانہ کردار کا سختی سے محاسبہ کرتے ہیں۔ نیز عضدالدولہ کے سوانح حیات درج کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ شاید جو نیک کام اس نے کیے تھے وہ آخرت میں اس کے گناہوں کا کفارہ بن جائیں۔ علی بن عیسیٰ جیسا متقی وزیر بھی اُن کے احتساب سے نہ بچ سکا۔ جسے وہ اقتدار کا حریص قرار دیتے ہیں۔

ابن مسکویہ اگرچہ تاریخ کے واقعات کو بڑے سلیس و متین انداز میں پیش فرماتے ہیں۔ لیکن شخصیات کی کردار نگاری اور بعض واقعات کی ڈرامائی منظر کشی میں اُنہیں ایسا کمال حاصل ہے کہ انسان داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مثلاً وزیر حمید بن العباس۔ نے منصور ابن حلاج پر جو مقدمہ چلایا اس کی روداد بڑی اثر انگیز ہے۔ اور ابن مقلہ کو جس طرح جامِ موت پینا پڑا اس کا بیان بڑا لرزہ خیز اور کرب انگیز ہے۔ تجارب الامم کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ ابن مسکویہ تاریخ کی ظاہری ہیئت سے نہیں بلکہ اس روحِ عصر سے وابستگی رکھتا ہے جو گوناگوں واقعات کے پیچھے کارفرما ہوتی ہے۔ اس طرح سلسلۂ اسناد کو سرے سے حذف کر کے ابن مسکویہ نے یہ ظاہر کیا ہے کہ اُنہیں کسی واقعہ کے راوی یا راویان سے کوئی دلچسپی نہیں۔ بلکہ وہ واقعے کی تہ میں اتر کر اس کے حقیقی اسباب و علل کو جاننا چاہتے ہیں۔

ابن مسکویہ کو اپنے پیش رَو مؤرخین پر اس لحاظ سے بھی امتیاز حاصل ہے کہ وہ مملکت کے نظم و نسق، مالیاتی نظام اور جنگ کے حربی اصولوں میں گہری بصیرت رکھتے تھے۔ امام المؤرخین علامہ طبری کی تاریخ میں ہمیں حکومت کے اقتصادی نظام اور ٹیکسوں کے بارے میں صرف اجمالی اشارات ملتے ہیں۔ لیکن ابن مسکویہ "تجارب الامم" میں ان عنوانات پر بڑے فکر انگیز مباحث قلم بند فرماتے ہیں

اسی طرح حربی اور عسکری پہلوؤں پر اُن کے تبصرے بڑے معلومات افزا ہیں۔ مثلاً مہلب کا بغاوتوں کو فرو کرنے میں ناکام رہنا۔ یا بختیار کا جنگ میں اپنی بے تدبیریوں سے نقصان اُٹھانا وغیرہ۔

غرضیکہ ابن مسکویہ نے اپنے سیاسی تجربے، فلسفیانہ بصیرت۔ حکیمانہ اندازِ فکر اور موثر پیرایۂ بیان کی بدولت تاریخ نگاری کو چوتھی صدی میں ذروۂ کمال تک پہنچا دیا۔

ابو منصور ثعالبی لکھتے ہیں کہ ابن مسکویہ ادب، بلاغت اور شعر میں درجۂ کمال کے مالک تھے۔

ابو حیان اپنی عالمانہ تالیف "امتاع" میں رقم طراز ہیں کہ ابن مسکویہ اغنیا میں فقیر اور بلند مرتبہ انسانوں میں مستغنی المزاج تھے۔ محمد لطفی جمعہ کے نزدیک "ابن مسکویہ اُن باعمل عظیم مفکرین میں سے تھے جو اقوام میں شاذ و نادر پیدا ہوتے ہیں۔ اور جن کا تحقیقی فلسفہ بڑا ٹھوس اور متناسب الاجزا ہوتا ہے"۔ مارگولیتھ کی محتاط رائے ہے۔ "اگرچہ ابن مسکویہ نے طبری سے خوشہ چینی کی ہے۔ لیکن فن تاریخ نگاری میں وُہ علامہ طبری سے فائق ہیں۔ [۱]

نوٹ۔ ابن مسکویہ اور آلِ بویہ کے الفاظ عام اُردو دان طبقے کی سہولت کے لیے لکھے گئے ہیں۔
دراصل یہ الفاظ یوں ہیں:۔ ابن مسکوبیہ اور آل بوبیہ۔

[۱] خطبہ چہارم صفحہ ۱۲۹

ابنِ عبد البرؒ

ابو عمر یوسف بن عبد اللہ ابن عبد البر حدیث و تاریخ کے شہرہ آفاق محقق اور مالکی فقہ کے عظیم مجتہد تھے۔ آپ کا وطن قرطبہ ہے جو اندلس کا پایۂ تخت اور مدینۃ العلم تھا۔ آپ کا سنِ پیدائش ۳۶۸ھ ہے خداداد ذہانت و فراست کے مالک تھے۔ چنانچہ بہت جلد علمی منزلیں طے کرتے ہوئے امامِ وقت بن گئے۔ بڑے حق پسند اور حق گو تھے۔ جس کی پاداش میں حکّامِ وقت نے انہیں جلا وطن کر دیا۔ عرصہ بعد قسمت نے یاوری کی تو لشبونہ کے قاضی مقرر ہوئے۔ فرائضِ قضاء کے ساتھ درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کے لیے وقت نکالتے رہے اور ۴۶۳ھ میں وفات پائی آپ کی اکثر و بیشتر تالیفات تلف ہو گئیں جو باقی ہیں وہ یہ ہیں :۔

(۱) کتاب الاستیعاب فی اسماء الصحابہ

(۲) جامع بیان العلم و فضلہ

(۳) کتاب التمہید لما فی الموطا من المعانی والاسانید۔

مؤخر الذکر کتاب زیورِ طباعت سے ابھی تک آراستہ نہیں ہو سکی۔ اول الذکر دونوں تالیفات طبع ہو کر نہ صرف منظرِ عام پر آ چکی ہیں بلکہ اربابِ علم و فضل سے خراجِ تحسین حاصل کر چکی ہیں۔

"کتاب الاستیعاب" حیدر آباد دکن میں دو جلدوں میں چھپ چکی ہے۔ ابنِ حجر عسقلانی کا ارشاد عالی ہے۔ "ابن عبد البر کی تالیفات بے مثل ہیں اور ان میں سے ایک الاستیعاب ہے جس کے مرتبے کی کوئی کتاب "سیرۃ الصحابہ" میں نہیں ہے"۔ عصرِ حاضر کے نامور مفسر مولانا ابو الاعلیٰ لکھتے ہیں "صحابہ کی سیرت کے معاملہ میں ان کی الاستیعاب پر آخر کون ہے جس نے اعتماد نہ کیا ہو۔" اور اس میں کوئی شک نہیں کہ سیرتِ صحابہ کے موضوع پر یہ کتاب مستند ترین ماخذ کا درجہ رکھتی ہے۔ اس میں نہ صرف صحابہ کے اسمائے گرامی مذکور ہیں بلکہ ان کے حالاتِ زندگی بھی اختصار سے درج ہیں۔ جنہیں پڑھ کر ایمان تازہ ہوتا ہے۔ اور آنحضورؐ کے اس ارشادِ گرامی کی معنویت آشکارا ہوتی ہے۔ "میرے صحابہ ستاروں کی مانند ہیں ان میں سے

تم جس کسی کی پیروی کروگے ہدایت پاؤگے۔"

علامہ ابنِ عبدالبرؒ کی دوسری معروف تالیف "جامع بیان العلم" محدثین کرام کے طریق پر مرتب ہوئی ہے۔ اور ہر باب میں روائتیں کچھ اس خوبی سے جمع کی گئی ہیں کہ موضوع کے خشک ہونے کے باوجود کتاب بڑی دلچسپ بن گئی ہے۔ اس کی اسانید کی طوالت سے بچنے کے لیے مصری علماء نے اس کتاب کا اختصار شائع کر دیا ہے۔ جس سے کتاب کی دلچسپی اور افادیت دوچند ہو گئی ہے۔ اسی اختصار کا مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی نے اُردو ترجمہ کیا ہے جسے "العلم والعلماء" کے نام سے ندوۃ المصنفین نے شائع کیا ہے۔

فاضل مترجم لکھتے ہیں:۔ "عربی ادب میں جامع بیان العلم وفضلہ بڑے پائے کی کتاب مانی جاتی ہے۔ علم اور فضیلتِ علم پر اس سے بہتر اور جامع کتاب نہیں دیکھی گئی۔ اسلامی نقطۂ نظر سے علم اور اہلِ علم اور طالبانِ علم کے بارے میں آدمی جو کچھ جانتا ہے۔ اس کتاب میں موجود ملے گا۔"

ہماری ذاتی رائے یہ ہے کہ اس کتاب کے مباحث اتنے گراں مایہ ہیں کہ ابن عبدالبر کا شمار ماہرینِ تعلیم کی صفِ اوّل میں کیا جا سکتا ہے اور آج جبکہ پاکستان میں ملی نظامِ تعلیم استوار کرنے کے لیے سوچ بچار ہو رہی ہے۔ یہ تالیف ہمارے ماہرینِ تعلیم کی خصوصی توجہ کی مستحق ہے۔

یہاں اس امر کی طرف اشارہ کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ علامہ موصوف نے "عُلم الانساب" کے موضوع پر دو کتابیں لکھی ہیں۔ جمہرۃ الانساب، اور کتاب القصد والامم فی التعریف بانساب العرب والعجم۔ جن کا حوالہ ابن خلدون نے اپنی تاریخ میں جابجا دیا ہے۔ یہ دونوں کتابیں فنِ انساب کی اُمہات کتب میں شمار ہوتی ہیں۔

ابنِ عبدالبرؒ کا شمار اُندلس کے چوٹی کے علماء میں ہوتا ہے۔ چنانچہ :۔

ابوالولید الباجی کا قول ہے:۔ "اندلس میں ابوعمر جیسا کوئی عالم حدیث نہیں پیدا ہوا۔"

ابنِ حزم فرماتے ہیں:۔ "میرے علم میں فقہ حدیث پر کلام کرنے والا ان کے برابر کوئی نہیں چہ جائیکہ کوئی ان سے بہتر ہوتا۔"

حافظ ذہبی نے اپنی محققانہ تالیف "تذکرۃ الحفاظ" میں ابن عبدالبرؒ کو شیخ الاسلام کے لقب سے سرفراز کیا ہے۔

ابنِ حزم

ابو محمد علی بن احمد بن سعید بن حزم اُندلس کے مشاہیر علماء میں سے ہیں، وہ ایک ممتاز عالمِ دین عظیم مورّخ، بلند پایہ متکلم اور زبردست شاعر تھے۔ جنہوں نے اپنے پیچھے چار سو تالیفات چھوڑی تھیں۔ جو اسّی ہزار صفحات پر پھیلی ہوئی تھیں۔ لیکن صد افسوس کہ دستبردِ زمانہ سے ان کی صرف چند تالیفات محفوظ رہ سکیں۔

علاّمہ موصوف قرطبہ کے ایک گاؤں (لیشم) میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد محترم وزارت کے عہدے پر فائز تھے۔ اس لیے ابن حزم کی ابتدائی زندگی بڑے ناز و نعم میں گذری۔ لیکن مروّجہ علوم و فنون کی تحصیل میں انہوں نے کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ حتیٰ کہ ان علوم میں سے اکثر و بیشتر میں انہوں نے کمال پیدا کر لیا۔ ابنِ حزم کا دورِ شباب سیاسی مصروفیات میں گذرا۔ کہیں ہم اُنہیں ابنِ حزم عبدالرحمٰن الرابع مرتضیٰ کا قلمدانِ وزارت سنبھالے دیکھتے ہیں تو کہیں وہ ہمیں (عبدالرحمٰن الرابع مرتضیٰ کے قتل کے بعد) پسِ دیوارِ زنداں نظر آتے ہیں، کبھی وہ جنگِ غرناطہ میں دادِ شجاعت دیتے ہوئے نظر آتے ہیں، اور کبھی وہ عیسائیوں کے مجبور و مقہور اسیر بن جاتے ہیں۔ اندلس میں خانہ جنگیوں اور انقلاباتِ زمانہ کی نیرنگیوں سے تنگ آ کر انہوں نے درس و تدریس کا مشغلہ اختیار کیا اور سیاسی کاموں سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ درس و تدریس کے ساتھ ساتھ انہیں مناظرے کا بڑا شوق تھا اور بلاشبہ اس فن کے وہ امام تھے۔ ابن حیّان رقم طراز ہے۔ "جو کوئی ان سے مناظرہ کرتا تھا وہ ان کی سنگ باری سے محفوظ نہ رہتا تھا اور یہ بات زبان زدِ خاص و عام تھی کہ" ابنِ حزم کی قلم حجاج بن یوسف کی تلوار کے مثل کاٹ کرتی ہے "۔

ابنِ حزم مخصوص افکار رکھتے تھے۔ چنانچہ انہیں شروع شروع میں اندلس کے بعض اُمرا اور حکام کی سرپرستی حاصل رہی۔ لیکن معاصر علماء کی مخالفت کے سبب آخر عمر میں اُنہیں گوشہ نشینی اختیار کرنا پڑی۔ جہاں طالب علموں کی ایک قلیل جماعت ان سے مستفید ہوتی رہی جن میں مورّخ حمیدی بھی تھے۔ ابن حزم علمائے عصر کی ملامت کی پرواہ کیے بغیر اپنے افکار پھیلاتے رہے حتیٰ کہ ۴۵۶ھ میں وفات پا گئے۔

کہتے ہیں کہ منصور موحدی نے ان کے مزار پر کھڑے ہو کر کہا تھا "تمام علمائے اندلس پیچیدہ مسائل میں ابنِ حزم کے خوشہ چین ہیں۔"

ابنِ حزم کی تالیفات میں سے ایک مختصر تالیف جوامع السیرۃ ہے جو سوا دو سو (۲۲۵) صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ یہ کتاب اُنھوں نے جس والہانہ عقیدت سے لکھی ہے اس کا اندازہ درجِ ذیل اقتباس سے کیا جا سکتا ہے۔

"رسول اکرمؐ کی سیرت کا جو شخص بغور مطالعہ کرے گا۔ آنحضرتؐ کی نبوت کی تصدیق پر مجبور ہو جائے گا۔ کیونکہ آنحضرتؐ کی سیرتِ طیبہ اس اَمر کی شہادت دیتی ہے کہ آپؐ اللہ کے سچے پیغمبر تھے اس (سیرتِ مبارکہ) کے سوا اگر رسالتمآب کے پاس اور کوئی بھی معجزہ نہ ہوتا تب بھی سیرت بطور معجزہ کے آپ کے لیے کافی تھی۔"

علامہ موصوف کی ایک تاریخی تالیف "جمہرۃ انساب العرب" ہے جس میں عرب قبائل کے انساب کا بیان ہے۔ اس کتاب کی علمی منزلت کا اندازہ اس امر سے کیا جا سکتا ہے کہ جہاں کہیں عربوں کے انساب کی بحث آتی ہے۔ ابن خلدون، علامہ ابنِ حزم کی اسی تالیف کا اکثر و بیشتر حوالہ دیتے ہیں۔

فنِ تاریخ میں علامہ ابن حزم کی ایک تالیف نقط العُروس فی تاریخ الخلفاء ہے لیکن کمیاب ہے۔ کتاب کا مضمون اس کے نام سے ظاہر ہے۔

ابنِ حزم کی مؤرخانہ بصیرت اور ادیبانہ صلاحیت کا اندازہ مندرجہ ذیل دو اقتباسات سے کیا جا سکتا ہے۔ جس میں اُموی و عباسی خانوادوں کا تقابلی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

"اب بنو امیہ کی حکومت ختم ہو گئی۔ بہر حال وہ ایک عربی حکومت تھی۔ بنو امیہ نے کوئی دارالحکومت یا محل سرائے نہیں بنائی۔ ان میں ہر امیر کی سکونت اسی مکان اور اسی احاطے میں ہوتی تھی جو خلافت سے پہلے ان کے پاس ہوا کرتا تھا۔ انھوں نے مسلمانوں کو اس امر پر ہرگز مجبور نہیں کیا کہ غلاموں کی مانند اُنھیں شاہانہ القابات سے پکاریں۔ یا زمین بوسی و قدم بوسی کریں۔ ان کا مقصد دُور دراز ممالک مثلاً اندلس۔ چین، سندھ، خراسان، آرمینیہ، شام، عراق، مصر اور المغرب میں اپنی فرمانروائی کا سکہ رواں کرنا تھا۔"

"بنو عباس کی سلطنت گویا ایرانی سلطنت تھی۔ جس میں عربوں کی بالادستی ختم ہو گئی اور ۔۔۔

کے عجمی برسرِ اقتدار آ گئے۔ سلطنت میں کسروی انداز آ گیا۔ مگر یہ بات ضرور تھی کہ کسی صحابی کو علانیہ بُرا بھلا نہیں کہا جاتا تھا۔ بنو عباس کے زمانے میں مسلمانوں کی وحدت کا شیرازہ بکھر گیا اور ممالکِ اسلامیہ میں مختلف گروہوں کا غلبہ ہو گیا۔ اس خانہ جنگی کے دور میں اندلس اور سندھ کے متعدد شہروں پر کافروں نے دوبارہ قبضہ کر لیا۔"

ناظرین کرام دیکھ سکتے ہیں کہ ان چند الفاظ میں ابن حزم نے معانی کے قُلزم بہا دیئے ہیں۔

الخطیبُ البغدادی

حافظ ابو بکر احمد بن علی بن ثابت جو الخطیب البغدادی کے لقب سے معروف ہیں، ۳۹۲ھ میں درزجان میں پیدا ہوئے اور ۴۶۳ھ میں جامِ اجل نوش فرمایا۔ آپ غیر معمولی قوتِ حافظہ کے مالک تھے چنانچہ کم سنی میں اپنے زمانے کے جملہ علوم پر حاوی ہو گئے اور پانچویں صدی ہجری کے سب سے بڑے محدّث، مؤرخ اور خطیب ثابت ہوئے۔

خطیب بغدادی کو شروع ہی سے بغداد کے دینی مرکز میں علم تاریخ پڑھانے اور عباسی دارالحکومت کی مرکزی جامع مسجد (المنصور) میں علم حدیث سکھانے کا شوق تھا۔ ان تمنّاؤں کی تکمیل میں آپ نے حج بیت اللہ کے موقعہ پر دُعا کے لیے ہاتھ اُٹھائے۔ جنہیں بارگاہِ ایزدی میں شرفِ قبولیت سے نوازا گیا۔ چنانچہ عباسی خلیفہ القائم باللہ کے دورِ حکومت میں آپ کو بغداد میں علم تاریخ کی تدریس اور جامعہ منصور بغداد میں حدیث کا درس دینے کے مواقع نصیب ہوئے، اور اس طرح ان کی دونوں دلی مُرادیں پُوری ہُوئیں۔

الخطیب البغدادی علم حدیث اور علم تاریخ میں کتنی گہری بصیرت رکھتے تھے۔ اس کا اندازہ اس روایت سے کیا جا سکتا ہے کہ القائم باللہ (خلیفہ عباسی) کے سامنے یہودیوں نے جزیہ کی معافی کا ایک پروانہ پیش کیا اور یہ دعویٰ کیا کہ غزوۂ خیبر کے موقع پر پیغمبر اسلام نے یہ پروانہ جناب علیؓ مرتضیٰ کو لکھنے کا حکم صادر فرمایا تھا اور دو اکابر اصحابِ رسولؐ نے اس پر بطورِ گواہان دستخط بھی کیے تھے۔ خطیب بغدادی نے خداداد فراست سے سارے معاملے کو بھانپ لیا اور یہ کہہ کر یہودیوں کے فریب کا پردہ چاک کر دیا۔ کہ اُن گواہان میں سے ایک صحابی تو غزوۂ خیبر سے پہلے فوت ہو چکے تھے اور دُوسرے غزوۂ خیبر سے پورے ایک سال بعد حلقہ بگوشِ اسلام ہوئے تھے۔ اُن کی علم حدیث اور فنِ تاریخ میں اس مجتہدانہ بصیرت سے متاثر ہو کر بغداد کے وزیر اعلیٰ نے احکام صادر فرمائے کہ خطیب بغدادی کی

اجازت لیے بغیر کوئی عالم حدودِ بغداد میں مسندِ درس پر فائز نہیں ہو سکتا۔

الخطیب البغدادی کثیر التصانیف بزرگ ہیں۔ مرأۃ الزمان میں ابن جوزی نے، اور طبقات حفاظ میں، علامہ ذہبی نے آپ کی متعدد کتابوں کی فہرست پیش کی ہے۔ استاد محترم ڈاکٹر عنایت اللہ مرحوم صاحب کے خیال میں خطیب بغدادی کی کتابوں کی تعداد ستر کے قریب ہے۔ علم تاریخ میں آپ کی سب سے مشہور تصنیف "تاریخ بغداد" ہے جس کی چودہ جلدیں ہیں۔ اس کتاب کے ابتدائی ابواب میں عباسی دارالحکومت کے مختلف حصوں مثلاً محلات، دفاتر، مسجدوں اور سرکاری عمارتوں کا مجمل تذکرہ ہے اس کے بعد بغداد کے مشاہیر مثلاً خلفاء، اُمراء، علماء اور محدثین کے حالات کا مفصل بیان ہے جس میں نہ صرف ان اکابر کے حالاتِ زندگی مرقوم ہیں جو عروس البلاد میں پیدا ہوئے۔ بلکہ ایسے بزرگوں کے مقدس ناموں اور درخشندہ کارہائے نمایاں کا تذکرہ ہے۔ جو کسی دوسرے علاقہ میں پیدا ہوئے۔ لیکن جنہوں نے زندگی کے کسی دَور میں عروس البلاد کو اپنی علمی سرگرمیوں کا مرکز بنایا۔ کتاب کے آخر میں انہوں نے شافعی مسلک پر عمل پیرا ہونے والے محدثین و محققین کے کارناموں اور ان کی تالیفات کی جامع فہرست نذرِ قارئین فرمائی ہے۔ اس عظیم القدر تالیف نے بے حد شہرت پائی۔ بعد کے متعدد علماء نے اس کتاب کی شرحیں لکھیں ہیں۔ جن میں محقق بُنداری، ابن الدبیثی اور ابن النجار کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ خصوصاً ابن النجار کی شرح نہایت طویل اور مبسوط ہے۔ ڈاکٹر عنایت اللہ صاحب اس کتاب کے بارے میں لکھتے ہیں "اگر فاضل مؤرخ تاریخ بغداد کے علاوہ کوئی اور کتاب نہ بھی لکھتے تو یہی کتاب اُن کا علمی مرتبہ تسلیم کروانے کے لیے کافی تھی"۔

محققین نے اظہارِ حقیقت کے لیے علامہ موصوف کو "حافظ المشرق" کا لقب دیا ہے، جس سے اُن کے علمی مقام و مرتبے کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ سچ فرمایا تھا عظیم محدث ابن ماکولا نے کہ دارقطنی کے بعد خطیب بغدادی ایسا محدث بغداد کو نصیب نہیں ہوا۔

ابنِ صاعدِ اندلسی

علامہ ابن صاعد اندلسی ۴۲۰ھ میں قرطبہ میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے امام ابن حزم، فتح بن قاسم، اور ابوالولید ہشام جیسے متبحر علماء سے کما حقہٗ استفادہ کیا اور بہت جلد علمی فضیلت کے ساتھ ساتھ اُنہیں دنیوی عزّت و شہرت بھی حاصل ہوگئی۔ والیٔ طلیطلہ، امیر المامون یحیٰی بن الظافر نے اُن کی بے حد قدر افزائی فرمائی اور اُنہیں اپنا ندیم خاص بنا لیا۔ تاریخ میں علاّمہ ابنِ صاعد کا رتبہ، طبری ابن خلدون اور البیرونی سے کم نہیں۔ فلسفے میں ان کی علمیّت کا یہ حال تھا کہ ابو بکر محمد بن زکریّا رازی نے ارسطو پر جو اعتراضات کیے تھے۔ ان کی اچھے پیرائے میں تردید کی۔ طبقات میں علاّمہ صاعد نے منطق اور علمائے منطق کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس سے علم میں ان کا رتبہ مُسلَّم ہو جاتا ہے۔ دوسری اقوام کے مذاہب کے بارے میں وہ ابنِ حزم کے ہم سَر و ہم پلّہ ہیں اور فنِ طب میں اُنہیں خاصا درک حاصل ہے۔

ان کی آٹھ تالیفات میں سے صرف ایک تالیف "طبقات الامم" دستیاب ہے جو علاّمہ موصوف کے تبحّرِ علمی، وسعتِ نظر، محققانہ طرزِ تحریر، اور تاریخی ذوق کی ترجمان اور آئینہ دار ہے اور جسے نہ صرف اُندلس میں، بلکہ پورے عالم اسلام میں، بے پناہ مقبولیّت حاصل رہی ہے۔ بلاشُبہ اپنے مضمون کے لحاظ سے یہ تالیف انسانی سرمایۂ تاریخ میں منفرد شان کی حامل ہے۔ جس میں دنیا کی آٹھ بڑی اقوام کے علوم و معارف کی تاریخ قلم بند کی گئی ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ جس اختصار اور جامعیّت سے علاّمہ موصوف نے قرونِ وسطیٰ کی علمی تاریخ مرتب کی ہے اس کی نظیر نہ تو پہلی تالیفات میں ملتی ہے اور نہ بعد کی تصانیف میں نظر آتی ہے۔ چونکہ یہ کتاب فاضل مؤلف نے اپنی وفات سے دو سال قبل ۴۶۰ھ میں ترتیب دی تھی، اس لیے یہ اُن کے عُمر بھر کے تجربے و مطالعے کا نچوڑ ہے۔ اقوامِ عالم کے علوم و معارف کی اس لاجواب تاریخ کا مختصر خاکہ درج ذیل ہے، جس میں علاّمہ ممدوح نے آٹھ متمدن اقوام کے مذاہب، زبان، علوم، ادبیات، علماء اور حکمرانوں کے بارے میں (تاریخی ترتیب ملحوظ رکھتے ہوئے) بیش قیمت مواد، مربوط و منظّم

پیرائے میں پیش کیا ہے۔

علومِ ہند :۔

علومِ ہند کے بارے میں فاضل مؤلف نے جو پہلا باب باندھا ہے اُس میں لکھتے ہیں کہ سرزمینِ ہند دبستانِ حکمت کی کان اور عدل وسیاست کا سرچشمہ ہے۔ یہاں کے باشندے گندمی رنگت ہونے کے باوجود، بداخلاقی، کمینہ خوئی اور ضعفِ عقلی سے محفوظ ہیں۔ بلکہ عقل کی گہرائی، وسعتِ نظر اور تعمقِ علم میں ممتاز ہیں۔ انھوں نے علمِ ہندسہ اور حساب، علمِ ہیئت و نجوم میں بہرۂ وافر پایا۔ ان کے خواص، توحید کے قائل ہیں اور عوام شرک کے توہمات میں گرفتار ہیں، علمِ نجوم میں سدھانت اور آریہ بھٹ کے مکاتیبِ فکر نامور ہوئے۔ علمِ اخلاق میں "پنج تنتر" نہایت عمدہ تالیف ہے۔ علمِ حساب میں اہلِ ہند کی ذکاوتِ طبع قوتِ اختراع اور حُسنِ ایجاد قابلِ داد ہے۔ کنکہ علمِ نجوم کے علمائے قدیم میں مشہور زمانہ ہے۔ ان کے اکثر و بیشتر بادشاہ علم و ہنر کے مُربّی و سرپرست ہیں۔

علومِ فارس :۔

یہاں کے باشندے تمام قوموں سے اشرف اور ان کے بادشاہ دیگر اقوام کے سلاطین سے زیادہ معزز و محترم ہیں۔ ایرانی سب سے قدیم سلطنت کے مالک ہیں اور تمام شاہانِ رُوئے زمین کے نزدیک "ملک الملوک" کہلائے جانے کے لائق ہیں۔ اہلِ فارس نے علمِ طب پر خاص توجہ دی ہے۔ سیّاروں کی متعدد زیچیں (جنتریاں) تیار کی ہیں۔ اہلِ فارس سنین کا حساب لگانے میں اہلِ بابل اور چینیوں سے گوئے سبقت لے گئے ہیں اور علمِ نجوم پر ان کے علماء نے معرکۃ الآراء تالیفات سپُردِ قلم کیں۔ شروع شروع میں اہلِ ایران موحّد تھے۔ لیکن پھر صابیّت (ستارہ پرستی) کو اپنایا۔ بعد ازاں زرتشت کے مذہب پر ایمان لا کر مجوسی بن گئے۔ حتیٰ کہ حضرت عمرؓ کی افواج نے ایران کو فتح کر لیا۔ جس کے باشندوں کے اذہان و قلوب اب اسلام کے لیے مسخر ہو چکے ہیں۔

علومِ کلدان :۔

بابل و نینوا کے علاقوں میں کلدانی قدیم ترین قوم ہیں۔ ان میں جو فرمانروا گذرے ہیں، وہ نماردہ (نمرود) اور جبابرہ (جبار) کے القابات سے یاد کیے جاتے ہیں۔ ان کا پہلا بادشاہ، نمرود بن کوش تھا جس نے ایک گنبد و بالا محل تعمیر کروایا۔ اسی حکمران خاندان سے ابراہیم کا ہم عصر نمرود بن کنعان بھی تھا جو خدا وند قدوس

کا باغی و نافرمان تھا۔ کلدانی علماء اپنے علم و فضل کے لحاظ سے بہت بلند مرتبہ، اور علوم و فنون (ریاضیات و الٰہیات) میں بڑے طاق تھے۔ عوام ہیکل میں انبیاء اور سلاطین کی شبیہیں بنا کر پرستش کرتے تھے۔ ہرمس بابلی (سقراط کا ہم عصر) فلسفے اور علمِ نجوم کا قدیم ترین معلّم تھا۔ جس نے کواکب کی شعاعوں، اور بروجِ فلک کے بارے میں عالمانہ تالیفات مُرتب کیں۔ ہرمس، والیس اور اصطفن بابلی جیسے حکماء و فُضلاء نے بھی علمِ نجوم پر گراں قدر تصانیف قلم بند کی ہیں۔

علومِ یونان :-

اقوامِ عالم میں سے یونانی، شہرہ آفاق اور عظیم الشان سلطنتوں کے مالک رہے ہیں جن میں سکندرِ اعظم کا نام سرِفہرست ہے، جس نے ہفت اقلیم فتح کرنے کا عزم بالجزم کر رکھا تھا۔ سکندرِ اعظم کے بعد خاندان بطالسہ نے یونان پر حکمرانی کی۔ یونان کے عوام عقیدۃً بُت پرست اور ستارہ پرست تھے۔ البتہ خواص نے علومِ فلسفہ کی تمام شاخوں مثلاً منطق، طبیعات، الٰہیات، سیاستِ منزل اور سیاستِ مُدن پر خصوصی توجہ دی ہے، انباذُقلس، فیثاغورس، سُقراط، افلاطون اور ارسطو یونانیوں کے نادرۂ روزگار فلاسفہ ہیں (جنہیں حکمائے اسلام بھی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں) فنِ طب اور علمِ طبیعات (فزکس) میں بقراط و جالینوس متبحّر عالم ہو گزرے ہیں۔ عُلمائے ریاضیات میں ابلّونیوس، اقلیدس، ارسیمندس، قطون، ثیموفارس، افرخس کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ لیکن بطلیموس (مولف کتاب المجسطی) علمِ فلکیات کا نیرِ اعظم ہے۔

علومِ روما :-

روما بڑے جلیل القدر فرمانرواؤں کی سرزمین رہی ہے۔ یونانیوں کی زبان غریقیۃ (گریک) ہے اور رومیوں کی زبان لاطینی (لیٹن) ہے یونانیوں کے شہر بلادِ رُوم سے مُتّصل ہیں۔ ولادتِ مسیح سے پہلے شہر رُومہ کی بنیاد رکھی گئی۔ رُومُلش، رُومہ کا پہلا مشہور فرمانروا گذرا ہے۔ اس مملکت پر ۷۲۵ برس بعد تک ملوکِ قیاصرہ (قیصر) حکمران رہے۔ رومیوں کا پہلے پہل مذہب صابئیت (ستارہ پرستی) تھا، قسطنطین کے زمانے سے عیسائیت کو فروغ ہونا شروع ہوا۔ حتیٰ کہ مملکت کا مذہب عیسائیت قرار پایا۔ شہر رُومہ میں اہلِ روم کے متعدد عُلماء و حکماء گذرے ہیں۔ لیکن وہ اہلِ یونان کے اہلِ علم ان کی نسبت کم مرتبت ہیں۔

عُلومِ مصر:-

ازمنۂ قدیم میں اہلِ مصر، صاحب جاہ وحشم تھے۔ اُن کے آثارِ قدیمہ یعنی ان کی تاریخی عمارات، ہیکل۔ اور دارالعلوم، ہفت اقلیم میں بے مثال ہیں اور زبانِ حال سے مصریوں کے تمدن کی عظمتِ رفتہ کے داستان گو ہیں۔ یہاں قبطی، یونانی، رومی اور عمالیق اقوام مخلوط ہوگئی ہیں۔ البتہ قبطیوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ پہلے اہلِ مصر صابئی المذہب تھے۔ پھر بُت پرستی کی طرف مائل ہُوئے۔ بعد ازاں انہوں نے عیسائیت کو قبول کیا۔ اور اب اسلام ان کے رگ ورپے میں سرایت کیے ہوئے ہے۔ طوفانِ نوح سے پہلے ہُرمس ان کا معلمِ اوّل ہے۔ جو طِب نجوم اور کئی دوسرے علوم کا مدوّن تھا۔ طوفانِ نوح کے بعد ہُرمس ثانی، ہرقلس اسکندرانی، اسطانوس اور انفیلاؤس نے مختلف علوم مثل جغرافیہ، حساب، ہندسہ، ہیئت و نجوم میں معرکتہ الآراء تصانیف مرتب کیں۔ اسلام سے قبل اسکندریہ مصر کا پایہ تخت تھا اور اب فسطاط اس کا دارالخلافہ ہے۔

عُلومِ عرب۔

اسلام سے پہلے بُت پرستی اور کواکب پرستی عربوں کا مذہب تھا۔ اور یہ قوم طرح طرح کے مُشرکانہ توہمات میں گرفتار تھی۔ البتہ لُغت، شاعری اور خطابت پر انہیں بڑا ناز تھا۔ اُنہیں ستاروں کے طلوع و غروب اور انواء (نکھتروں) کے بارے میں خاصا وسیع علم حاصل تھا۔ فلسفے سے اس قوم کو کبھی شغف نہیں رہا۔ عہدِ اسلام میں عربوں کے ہاں صرف دو فلسفی پیدا ہوئے۔ ایک اسحاق کندی، دُوسرے ابو محمد حسن بن ہمدانی! طلوعِ اسلام کے بعد عرب قبائل کی پراگندگی اور بدنظمی کی جگہ، نظم و اتحادِ ملی نے لے لی۔ خدائے واحد کی تعظیم، اجزائے ایمان، ارکانِ دین، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اس قوم کی امتیازی علامات بن گئیں۔ آنحضورؐ کے بعد خلفائے راشدینؓ نے زمین کے دور دراز گوشوں تک اسلام کی حکومت کے دائرے کو وسیع کر دیا۔ اور صدیوں سے حکمرانی کا عَلَم اہلِ قریش کے ہاتھ میں ہے یا نصف سے زاید متمدن خطۂ ارضی کے اقتدار کی چابیاں ان کے پاس ہیں۔ اموی خلفاء کے دور میں حارث بن کلدہ، ابن الجبر کنانی اور خالد بن یزید، نے علمِ طب اور علمِ کیمیا میں نام پیدا کیا۔ عباسیوں کے دُور میں علوم و فنون کا سمندر موجزن ہے۔ عبداللہ بن مقفع نے منطق و ادبیات میں شہرت پائی۔ محمد بن ابراہیم فرازی نے علمِ نجوم میں کمال حاصل کیا۔ مامون الرشید کے دُور میں آلاتِ رصد کی مدد سے اس شعبۂ علم میں نئی نئی اختراعات و تحقیقات

ہوئیں۔ الکندی ذو فنون عالم تھا اور فیلسوف عرب کے لقب سے معروف تھا۔ محمد بن زکریا رازی، علوم فلسفہ و منطق میں ماہر اور فنِ طب میں پیشوائے زمانہ تھے۔ فارابی منطق میں تمام علمائے اسلام کا مُسلّم الثبوت امام سمجھا جاتا ہے۔ احمد بن عبداللہ الفرغانی، بنو موسیٰ، البتانی الفرازی سب علمِ نجوم کے ماہرین کامل تھے۔ جابر ابن حیان، علومِ طبیعات خصوصًا فنِ کیمیا کا ابوالآبار تھا۔ بلاشبہ عرب کے علوم پر ابنِ صاعد اندلسی کا مقالہ سب سے زیادہ پُر مغز، جامع، مفصّل اور معلومات افزا ہے۔

علومِ اُندلس :-

ابن صاعد اُندلسی کی یہ تحقیق ہے کہ جب تک یہ علاقہ (اُندلس) شاہانِ رُوما کے زیرِ نگین رہا، علم و حکمت سے خالی رہا۔ لیکن مسلمانوں کی آمد کے بعد یہ خطۂ ارض علوم و معارف کا گہوارہ بن گیا۔ اہالیانِ اندلس پہلے صابئی (ستارہ پرست) تھے۔ پھر عیسائی ہو گئے اور ۹۲ھ کے بعد اندلس میں اسلام کا چرچا ہونے لگا۔ اور جامع الکمالات علماء پیدا ہونے لگے۔ مثلاً ابو عبیدہ فقیہہ و محدّث بھی تھے اور علم نجوم کے ماہر بھی۔ ابن السیمنہ قرطبی حساب، نجوم اور طب میں دخل رکھتے تھے اور علومِ لسانی میں انہیں کامل دستگاہ حاصل تھی۔ محمد بن اسماعیل، منطق و حساب کے علاوہ، نحو اور لغت میں امام تھے۔ خلیفہ الحکم ثانی نے مشرقی ممالک کے علومِ قدیمہ و جدیدہ کی کتابوں سے ایسا ذخیرۂ کتب فراہم کر لیا جو خلفائے عباسیہ کے علمی سرمائے کی ہمسری کرنے لگا۔ ابو غالب الفرضی، علم حساب اور قوانین وراثت (علم الفرائض) میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ المقری علمِ حساب و علمِ ہندسہ کے پہلو بہ پہلو، نحو، لغت اور فقہ میں امام تھے۔ ابن حزم نے دینی اور عقلی علوم پر چار سو کے قریب کتابیں تالیف کر کے اُندلس کی شہرت کو چار چاند لگا دیئے۔ اُندلس کے مشاہیر کے حالات پر ابن صاعد نے خاصا مفصل مواد فراہم کیا ہے۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ فاضل مؤلف اپنی سرزمین کا نام روشن کرنا چاہتا ہے۔ اور اپنے مقصد میں علامہ ممدوح کو خاطر خواہ کامیابی حاصل ہوئی ہے۔

ابنِ صاعد اندلسی نے جن کتابوں سے استفادہ کر کے یہ تالیف مرتب کی ہے وہ یہ ہیں۔

کتاب الاکلیل وصفۃ جزیرۃ العرب الہمدانی!

کتاب المعارف لابن قتیبہ۔

التنبیہ والاشراف للمسعودی

کتاب الالوف و کتاب المذاکرات لابی معشر الفلکی۔

کتاب الفہرست لابن ندیم ۔

صلۃ التاریخ الطبری للفرغانی ۔

تاریخ الاطبا لابن جلجل اندلسی ۔

ابن صاعد اندلسی نے مستند ترین ماخذوں کی مدد سے متعدد اقوام کے علوم وفنون پر مختصر وجامع بحث کی ہے ۔ اور قوم عرب اور اندلس کے علوم ومعارف کا تفصیلی نقشہ مرتب کر دیا ہے ۔ اس کے باعث بلاشبہ اُنہیں مشرق ومغرب کے جملہ مصنفین ومحققین پر شرف تقدم حاصل ہے ۔ علمائے مشرق نے اس کتاب کے جو اقتباسات نقل کیے ہیں اس سے اس کی بے پناہ مقبولیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے ! ابن العبری ، ابن خلّکان ، ابن ابی اُصیبعہ ، مراکشی اور علّامہ ذہبی نے اس غیر فانی تالیف کے صفحوں کے صفحے اپنی تالیفات میں نقل کر دیئے ہیں اور اس کتاب کی علمی شان جامعیّت اور اختصار کی بے حد تعریف کی ہے ۔ مولانا سیّد سلیمان ندوی کا خیال ہے کہ :۔

"علوم کی تاریخ میں مسلمانوں نے جو کتابیں لکھی ہیں ۔ کتاب الفہرست ابن الندیم کے بعد اس سے بہتر کوئی کتاب نہیں ۔"

ابنِ عساکر

حافظ ابوالقاسم علی بن الحسن بن ہبتہ اللہ جو ابن عساکر دمشقی کے نام سے مشہور ہیں ۴۹۹ھ میں پیدا ہوئے اور ۵۷۲ھ میں وفات پائی۔ انہوں نے دمشق میں ابتدائی تعلیم حاصل کر لی۔ پھر بغداد میں تکمیلِ علم کے لیے پانچ برس گذارے اور وہاں کے نامور اساتذہ اور ممتاز شیوخ سے فیض اُٹھایا۔ علم کی تلاش میں الخطیب البغدادی کی طرح دُور دراز ممالک کے لیے سفر کیئے اور اس دَور کے بے شمار جیّد علماء سے استفادہ کیا جن میں متعدد خواتین بھی شامل ہیں جو اپنے علم و فضل کے لحاظ سے ممتاز تھیں۔

حافظ موصوف آخر کار دمشق واپس آئے۔ وہاں مدرسۂ نوریہ میں معلّم مقرر ہوئے اور تا حیات اس منصب پر فائز رہے۔ مؤرخین متفق ہیں کہ ابن عساکر نے زندگی کے آخری چالیس برس دمشق میں پوری یکسوئی کے ساتھ تعلیم و تدریس اور تصنیف و تالیف میں گذارے۔ لیکن ورثہ میں نہ دینار چھوڑے نہ درہم! اگرچہ ان کا شمار دمشق کے ممتاز علماء میں ہوتا تھا جنہیں عوام و خواص بے حد قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ تاہم اُنہوں نے ساری زندگی نام و نمود سے بے نیاز رہ کر، سادگی اور قناعت میں گذار دی۔ اُن کی تصانیف کی مفصّل فہرست یاقوتِ حموی نے ارشاد الاریب میں اور علاّمہ السبکی نے طبقات الشافعیہ میں نقل کی ہے۔ ان میں سے ایک اہم تصنیف "کتاب المعجم" ہے۔ جس میں شافعی مسلک کے جیّد علماء کے حالاتِ زندگی بڑی تفصیل سے مذکور ہیں۔ تاہم ابن عساکر کو شہرتِ دوام، اپنی کتاب "التاریخ الکبیر" یا تاریخ دمشق کے سبب حاصل ہے، جو محنت و کاوش کا نادر نمونہ، تحقیقِ واقعات و حوادث کا بہترین شاہکار اور حسنِ ترتیب کا یادگار علمی کارنامہ ہے۔

جس طرح الخطیب البغدادی نے عباسی دار الحکومت بغداد کے علماء و فضلاء کا مفصّل تذکرہ لکھا تھا۔ اُسی طرح ابنِ عساکر نے اُموی دار السلطنت دمشق کے مصنفین اور محققین کے مفصّل احوال قلم بند کیے ہیں۔ جو اسّی جلدوں میں تھے۔ جن میں سے تین جلدیں دستیاب ہیں اور فاضل محقق کی مؤرخانہ بصیرت

اور تبحّر علمی کا روشن ثبوت ہیں۔

ابن عساکر نے اپنی تالیف میں تاریخ نویسی کا وہی اسلوب اختیار کیا ہے، جو الخطیب البغدادی نے اپنایا تھا۔ چنانچہ علامہ موصوف نے نہ صرف اُن اکابر کے حالاتِ زندگی سپردِ قلم کیے ہیں جو دمشق میں پیدا ہوئے۔ بلکہ ان مشاہیر علماء و فضلاء کا تذکرہ بھی کیا ہے جنہوں نے دمشق میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ اور علم و فضل میں یکتائے زمانہ تھے۔ ابن عساکر نے تاریخ نگاری کے لیے سرزمین دمشق کا انتخاب اس لیے بھی کیا کہ وہ ان کا وطن مالُوف تھا اور اس لیے بھی کہ بساطِ سیاست پر دمشق دوبارہ ابھر رہا تھا۔ جبکہ نورالدین زنگی ہلال و صلیب کے معرکہ پر مسلمانوں کو دوبارہ منظم کر رہے تھے۔ اس لیے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ دمشق کا انتخاب یا موضوع بحث بننا اس دور کے عصری تقاضوں کے عین مطابق تھا۔

اسی طرح ابن عساکر کا روایات کے ساتھ ایک طرف سلسلۂ اسناد نقل کرنا اور دوسری طرف روایات کو عقلی اصولوں پر پرکھنا۔ یہ ظاہر کرتا ہے کہ مسلمانوں میں اب روایت و درایت دونوں کا پہلو بہ پہلو التزام ہونے لگا تھا۔ ابن عساکر نے اپنے پیش رو محدّثین اور مورّخ طبری کے تتبع میں اپنی تاریخی کتاب میں تمام واقعات کے ساتھ ساتھ راویوں اور طویل اسناد کا تذکرہ کیا ہے جس سے واقعات کا مستند و معتبر ہونا ثابت ہوتا ہے۔ اس کتاب کا وہ حصّہ نہایت بیش قیمت قرار دیا گیا ہے جس میں سیدنا حضرت ابوبکرؓ کے عہد خلافت کے حالات نہایت تحقیق و تدقیق اور شرح و بسط کے ساتھ درج کیے گئے ہیں۔ دراصل فاضل مورّخ کی ذاتی تحقیق یہ تھی کہ سیدنا ابوبکرؓ کسی زمانے میں دمشق تشریف لاتے تھے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

کچھ مدت پہلے، اس کتاب کی چند ابتدائی جلدیں عبدالقادر بدوان نے "تہذیب تاریخ ابن عساکر" کے نام سے شائع کر دیں۔ جن میں روایات کے تکرار کو ختم کر دیا گیا اور طویل اسناد کو حذف کر دیا گیا تاکہ کتاب پڑھنے والوں کو مطالعہ و فہم میں سہولت رہے۔ ابوالقاسم علی کی علمی فضیلت کا اندازہ اس امر سے کیا جا سکتا ہے کہ یاقوت الحموی جیسے فاضل مؤرخ نے اپنی تصانیف میں جابجا ابن عساکر کی "تاریخ دمشق" سے حوالے دیئے ہیں۔ جدید مصنفین میں سے مغربی مصنف مارگولیتھ عرب مؤرخین پر اپنے خطبات میں ابن عساکر کی تاریخ کو سوانح نگاری اور تذکرہ نویسی کا نقطۂ معراج قرار دیتا ہے۔

ابنِ جوزی

ابوالفرح عبدالرحمن ابن جوزی چھٹی صدی ہجری کے آتش بیان خطیب اور عظیم مورخ تھے۔ جو ۵۱۰ھ میں بغداد میں پیدا ہوئے۔ مذاقِ علم کی تکمیل اور حق کی تلاش و جستجو میں دُور دراز ممالک کی سیاحت کی اور علومِ متداولہ اپنے زمانے کے اکابر علماء سے حاصل کیے جن کی تعداد اٹھتر ۷۸ تک پہنچتی ہے۔

تکمیل علم کے بعد بغداد عروس البلاد میں سکونت اختیار کر لی اور تمام زندگی تصنیف و تالیف، درس و تدریس اور تذکیر و تبلیغ کے لیے وقف کر دی۔ جب ابن جوزی کے استاذِ محترم کا انتقال ہوا تو انہوں نے وعظ و تذکیر کی مسند پر بیٹھنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ لیکن عام لوگوں نے ان کی کم سنی کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس تجویز سے اختلاف کیا۔ البتہ جب انہوں نے جامع منصور میں وعظ فرمانا شروع کیا تو لوگوں کو ان کی غیر معمولی قوتِ فہم اور خداداد قدرتِ بیان کا کماحقہ اندازہ ہوا تو انہیں اپنے استاد کا صحیح جانشین تسلیم کر لیا گیا۔ بعدازاں ابن جوزی نے ۵۷۰ھ میں ایک مدرسے کی خود بنیاد رکھی اور درس و تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ان کے درس کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ پانچ ہزار سے دس ہزار تک شائقین ان کے درس میں باقاعدہ شریک ہوتے اور خلیفۂ وقت بھی آپ کے درس میں شرکت کو مایۂ افتخار سمجھتا۔ علامہ ممدوح وعظ فرماتے تو لوگ دیوانہ وار جمع ہو جاتے حتی کہ ان کی تعداد لاکھ ڈیڑھ لاکھ تک جا پہنچتی۔ انہوں نے خود اپنی کتاب میں ایک جگہ رقم فرمایا ہے کہ اُن کے مواعظ حسنہ سے متاثر ہو کر کم و بیش بیس ۲۰ ہزار یہودی اور نصرانی حلقہ بگوش اسلام ہوتے اور ایک لاکھ سے زاید مسلمان اپنی بداعمالیوں سے تائب ہو کر صراطِ مستقیم پر گامزن ہو گئے۔ جس طرح آپ خطابت کے میدان میں شہسوار تھے اُسی طرح انشار پردازی میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ چنانچہ جس روانی سے وعظ فرماتے اتنی ہی تیزی سے کتب تصنیف فرماتے۔ خود ان کا اپنا بیان ہے کہ میں نے تین سو ۳۰۰ کتابیں تصنیف کی ہیں جن کی مکمل فہرست انہوں نے ابن رجب کی ذیل (طبقات الحنابلہ) میں بیان فرمائی ہے۔

سبط ابن جوزی نے مرأۃ الزمان میں ان کی ڈھائی سو کتابوں کی فہرست پیش کی ہے۔ دائرۃ المعارف اسلامیہ (دانش گاہ پنجاب لاہور) کے مقالہ نگار نے تصریح کی ہے کہ ان کی سو کے قریب کتابیں آج بھی محفوظ ہیں۔

علامہ موصوف نے علم تاریخ پر ایک طویل و مبسوط کتاب بعنوان "المنتظم فی تاریخ الملوک والأمم" تحریر فرمائی ہے جس میں علامہ موصوف نے ابتدائے آفرینش سے لے کر حضور رسالت مآب کے عہد مبارک تک کے واقعات کو عمومی انداز میں جمع و مرتب کیا ہے۔ رسول اکرم کی حیات طیبہ پر بڑی شرح و بسط سے روشنی ڈالی ہے۔ عہد رسالت کے اختتام سے ابن جوزی نے کتاب کو سنین کے اعتبار سے ترتیب دیا ہے اور ۵۷۴ھ تک کے تمام تاریخی واقعات قلم بند فرماتے ہیں۔ جن میں علمائے دین اور محدثین کرام کے حالات تفصیل سے دیئے گئے ہیں غور سے دیکھا جائے تو "المنتظم" تاریخ و سوانح دونوں کا انوکھا مجموعہ اور اچھوتا مرکب ہے۔ جس میں ہر دس سال کے تاریخی واقعات کے بیان کے بعد اُس زمانے کے مشاہیر کے مفصل حالات زندگی حیطۂ تحریر میں لائے گئے ہیں۔ اس منفرد انداز تدوین سے مختلف ادوار کی سیاسی، معاشرتی اور علمی حالت کا واضح و جامع نقشہ بیک نظر قاری کے سامنے آجاتا ہے۔ بعد کے مؤرخین و سوانح نویسوں نے اس تصنیف سے بھرپور استفادہ کیا ہے جس سے اس تالیف کی حقیقی افادیت اور صحیح قدر و قیمت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

علامہ ممدوح نے تفسیر قرآن اور علم حدیث پر بھی متعدد کتابیں سپردِ قلم فرمائی ہیں۔ نیز خلیفہ راشد حضرت عمر بن الخطابؓ اور نیک نفس اُموی خلیفہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کے اخلاقی محاسن اور تاریخی کارناموں پر بڑا عمدہ مواد فراہم کیا ہے۔ جو "سیرت عمرینؓ" کے نام سے علمی دنیا میں معروف ہے۔

کتاب القصاص والذکرین میں ابن جوزی نے تاریخ اسلام کے ایسے لاطائل اور بے بنیاد قصوں کو چھانٹ کر الگ کر دیا ہے۔ جو غیر مسلم قوموں خصوصاً یہود و نصاریٰ کے زیر اثر سادہ لوح مسلمانوں میں پھیل گئے اور ان کے دل و دماغ کو پراگندہ کر رہے تھے۔

ان ساری کتابوں میں اسلوب نگارش ادیبانہ اور ساحرانہ ہے جس کے سبب قاری مطالعہ کے دوران ذرہ برابر اکتاہٹ محسوس نہیں کرتا۔ اپنے اثر انگیز خطبوں اور تین سو کے لگ بھگ تالیفو ں

کی وجہ سے ابن جوزی کو عالم اسلام میں ممتاز مقام اور لازوال شہرت حاصل ہے۔

علم تاریخ کے فوائد :۔

اکثر و بیشتر مؤرخین نے تاریخ کے فوائد پر روشنی ڈالی ہے۔ لیکن ان میں سے حافظ ابن جوزی کا اسلوبِ استدلال اور طرزِ نگارش سب سے زیادہ دلچسپ اور دلآویز ہے۔ چنانچہ اُن کے دو اقتباسات قارئین کی ضیافتِ طبع کے لیے پیش کیے جاتے ہیں۔ حافظ موصوف لکھتے ہیں :۔

"سیرت اور تاریخ میں بہت سے فائدے مضمر ہیں۔ جن میں دو بڑے اہم ہیں۔

اوّل یہ کہ جب کسی صاحبِ تدبیر شخص کی سیرت اور اس کا انجام کار مذکور ہوتا ہے تو اس سے حسنِ تدبیر اور سمجھ بوجھ سے کام کرنے کا سبق حاصل ہوتا ہے۔ اسی طرح جب کسی ناکارہ شخص کی سیرت اور اس کا انجام کار بیان کیا جاتا ہے تو کوتاہی عمل سے ڈرنے کا سامان بنتا ہے۔ با اختیار لوگ اس سے ادب سیکھتے ہیں اور غور کرنے والے عبرت پکڑتے ہیں جس کے نتیجہ کے طور پر عقل کی تلوار صیقل ہو جاتی ہے اور منقولات سے لطف اٹھانے والے کے لیے ایک چمنستان آراستہ ہو جاتا ہے"۔

دوئم "یہ کہ تاریخ کے ذریعے عجیب و غریب واقعات، زمانے کے اُلٹ پھیر، تقدیر کے چکر اور سننے کے لائق خبریں معلوم ہوتی ہیں"۔

(ماخوذ از مقدمہ المنتظم)

"تاریخ اور سیرت کے تذکرے قلب کو سکون بخشتے، غم کو دُور کرتے اور عقل کو بیدار کرتے ہیں۔ جب دنیا کے عجائبات کا ذکر ہوتا ہے تو خالق کی عظمت کا یقین بڑھ جاتا ہے۔ جب کسی صاحب تدبیر کی سیرت بیان ہوتی ہے تو حُسنِ تدبیر کا درس ملتا ہے۔ جب کسی ناکارہ انسان کا تذکرہ ہوتا ہے تو بے احتیاطی سے ڈر آنے لگتا ہے اور اگر کسی خوش بخت انسان کے حالات بیان ہوتے ہیں تو لازماً نصیبوں کی گوناگونی پر تعجب ہوتا ہے اور ویسا ہی لطف حاصل ہوتا ہے جیسے بزمِ شبانہ میں تفریحی باتوں سے"!

(ماخوذ از شذور العقود فی تاریخ العھود)

آخر میں ہم علامہ ابنِ جوزی کے بارے میں چند محققین کی آراء پیش کرتے ہیں :۔

علامہ ابنِ تیمیہ فرماتے ہیں کہ ابن جوزی کی تالیفات ایک ہزار سے زاید تھیں۔

علامہ سبکی نے اپنی تالیف "معید النعم" میں قارئین کو ابن جوزی کی مہتم بالشان تالیفات کے مطالعے کی تلقین کی ہے۔

ابن بطوطہ علامہ موصوف کے مواعظ کی اثر آفرینی کا ثنا خواں ہے۔

حاجی خلیفہ نے کشف الظنون میں اور علامہ ذھبی نے تذکرۃ الحفاظ میں ابن جوزی کے مختصر سوانح کے پہلو بہ پہلو اُن کی تالیفات کی مفصل فہرست درج کی ہے۔

ابن الاثیر اپنی تالیف "کتاب الکامل" میں ابن جوزی کا بڑے ادب واحترام سے تذکرہ کرتا ہے۔

ابن الاثیر

عزالدین ابن الاثیر جزری چھٹی صدی ہجری کے ممتاز مورخ اور عالم حدیث ہیں۔ الجزیرہ میں ۵۵۰ھ میں پیدا ہوئے، علم ورثے میں پایا۔ آپ کے ایک بھائی مبارک تھے جنہوں نے "نہایۃ فی غریب الحدیث" لکھی۔ اور دوسرے بھائی ضیاء الدین تھے۔ جن کی تالیف "المثل السائر" بڑی مشہور ہے۔ تینوں بھائی اپنے زمانے کے جید عالم تھے۔ ابن الاثیر نے ابتدائی تعلیم اپنے والد سے پائی۔ جن کے ہمراہ وہ موصل بھی گئے اور وہاں کے علماء سے فیض پایا۔ تکمیلِ علم کے لیے بلادِ اسلامیہ کی سیاحت کی خصوصًا بغداد، شام اور بیت المقدس کے علماء سے استفادہ کیا۔ پھر موصل واپس لوٹ آئے اور درس و تدریس نیز تصنیف و تالیف کے مشاغل میں زندگی گذار دی اور ۶۳۰ھ میں داعیٔ اجل کو لبیک کہی۔

ابن الاثیر کی تصانیف میں ایک یادگار زمانہ کتاب "اسد الغابہ فی معرفۃ الصحابہ" ہے جس میں سات ہزار پانچ سو صحابہ کے حالاتِ زندگی قلم بند کیے گئے ہیں اور پہلوں نے علمِ اسماء الرجال کا جو سرمایہ پیش کیا تھا اُسے اس کتاب میں جمع کر دیا گیا ہے۔ صحت اور جامعیت کے اعتبار سے اس تالیف کو اس فن کی پہلی تمام کتابوں پر فوقیت حاصل ہے۔ امام موصوف نے علامہ سمعانی کی کتاب الانساب کا خلاصہ لکھا جو **لبّ اللباب فی تہذیب الانساب** کے نام سے مشہور ہے۔ ابن الاثیر نے اس کتاب کا خلاصہ بڑی محنت اور دیانت سے کیا ہے۔ ابن خلکان کا خیال ہے کہ یہ خلاصہ اصل کتاب سے بہتر ہے۔ جس میں اسناد کو مختصر کر دیا گیا ہے اور مکرّر واقعات کو نکال دیا گیا ہے۔

فاضل مورخ کی تیسری مشہور تالیف "التاریخ الباہر" المعروف تاریخ الدولۃ الاتابکیہ ہے جس میں خانوادۂ اتابیگ کی تین سو سالہ تاریخ کے واقعات کا لب لباب پیش کیا گیا ہے۔ اس موضوع پر یہ کتاب منفرد اہمیت کی حامل ہے۔

لیکن جس تالیف نے ابن الاثیر کے نام کو زندہ جاوید بنا دیا وہ اس کی شہرہ آفاق تالیف "الکامل

فی التاریخ" ہے۔ فاضل مولف نے پہلی فنِ تاریخ کی کتب پر ناقدانہ نظر ڈالی تو محسوس کیا کہ کہیں واقعات کی غیر موزوں تکرار ہے۔ کہیں معانی حُسنِ کلام کے پردوں میں چھپے ہُوئے ہیں۔ کہیں بعض حقائق سے پہلو تہی کی گئی ہے۔ کہیں مشرقی ممالک کا تذکرہ مفصّل ہے۔ مگر مغربی اقالیم کے حالات تشنہ ہیں۔ اور کہیں مغربی ممالک کے حالات خاصے مفصّل ہیں۔ لیکن مشرقی ممالک کے کوائف بے حد مجمل و نا تمام ہیں۔ لہٰذا انھوں نے ایک ایسی عالمی تاریخ لکھنے کا ارادہ کیا۔ جو نہ صرف ان عیوب سے پاک ہو بلکہ گوناگوں محاسن و اوصاف کا مرقّع ہو۔

ابن الاثیر نے اسلام کی پہلی تین صدیوں کے حالات طبری کی تاریخ سے اخذ کیے لیکن اس اہتمام کے ساتھ کہ اسناد کو حذف کر دیا۔ غیر ضروری واقعات کو نظر انداز کر دیا۔ اور منتشر روایات کو باہم ملا کر مسلسل بیان کی صورت دے دی۔ یہ کتاب ۶۲۷ھ تک کے واقعات کو محیط ہے۔ آخری تین صدیوں کے حالات فاضل مؤلف نے مختلف مؤرخین سے اخذ کیے ہیں۔ خصوصاً تاریخ کا وہ حصّہ قابلِ مطالعہ ہے جو غوری اور غزنوی خاندانوں سے تعلق رکھتا ہے۔ تاریخی واقعات کی تنقیح اور حقائق کی تہذیب میں ابن الاثیر نے اتنی کاوش اور مہارت کا ثبوت دیا کہ لوگ کافی حد تک طبری کی تالیف الرسل والملوک سے بے نیاز ہو گئے۔ بلاشبہ تاریخ طبری کے بعد عمومی تاریخ دنیائے اسلام میں مشہور و مقبول کتاب "الکامل فی التاریخ" ہی ہے۔ جسے دائرۃ المعارف اسلام میں ایک نادر الوجود اور بیش قیمت تالیف قرار دیا گیا ہے۔

ابن الاثیر ان خوش بخت مؤرخین میں سے ہیں جنہیں نہ صرف ان کے اخلاف نے بھرپور خراجِ تحسین پیش کیا ہے، بلکہ ان کے معاصرین نے بھی رشک و احترام کی نگاہوں سے دیکھا۔ علامہ ابن خلکان کا قول ہے۔ "ابن الاثیر علمِ حدیث کے امام اور تاریخی تالیفات کے حافظ ہیں۔ شمس الدین یوسف سبط ابن جوزی جیسا فاضل علامہ موصوف کو اپنا مرشد و معلّم قرار دیتا ہے۔ مؤرخ ابن کثیر آپ کو علماء کا سرخیل قرار دیتے ہوئے باعثِ صد احترام سمجھتے ہیں۔ علامہ الذہبی آپ کو ایک عظیم المرتبت ہستی اور باکمال شخصیت تصوّر کرتے ہیں۔ ابن العماد حنبلی فرماتے ہیں کہ آپ بے مثال امام، نسّاب، مورّخ اور ادیب تھے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ابن خلدون نے اپنی تاریخ میں جابجا "کتاب الکامل" سے جو حوالے دیتے ہیں، وُہ اس کتاب کی ناقابلِ فراموش عظمت کی غمّازی کرتے ہیں۔

جدید محققین میں سے سید امیر علی ابن الاثیر کو طبری اور مسعودی کا ہم پلّہ مورّخ قرار دیتے ہیں۔

اور علامہ شبلیؒ ابن الاثیر کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے رائے دیتے ہیں کہ ابن الاثیر سے بعد کے جملہ مؤرخین نے اس قدر التفات و استفادہ کیا کہ قدیم تصانیف نظروں سے اوجھل ہو گئیں۔ ابن خلکان نے ابن اثیر جزری کی تالیف کتاب الکامل کو بجا طور پر مِنْ خِیَارِ التَّارِیْخِ کہا ہے۔

فاضلانہ تبصرہ :-

آخر میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی انسائیکلو پیڈیا مرتبہ محمد عبدالمقیت نیموی (مطبوعہ جدید پریس بیگم پورہ پٹنہ شہر، جلد ۱ جزو ۲) کا ایک طویل اقتباس نقل کر دیا جائے جس میں ابن اثیر کی کتاب الکامل پر بڑے ناقدانہ انداز میں ایک فاضلانہ شذرہ سپرد قلم و قرطاس فرمایا ہے۔

"اس میں کوئی شک نہیں کہ "الکامل" جو بارہ جلدوں میں ہے۔ ابن اثیر کی نہایت مہتم بالشان اور مشہور تالیف ہے۔ اس کی سات ابتدائی جلدوں کا سب سے بڑا ماخذ تاریخ ابو جعفر طبری ہے۔ ابن اثیر نے طبری کا اختصار کر دیا ہے۔ اس کے اسانید کو حذف کر کے اور زائد باتوں کو چھوڑ کر ایک ہی روایت پر اکتفا کیا ہے۔ اس کے ساتھ دوسرے ماخذ مثلاً ابن الکلبی ہبرد، بلاذری اور مسعودی سے وہ چیزیں لی ہیں جنہیں طبری نے قصداً یا بلا قصد چھوڑ دیا تھا۔ مثلاً زمانۂ عرب قبل اسلام، وقائع تغلب وقیس سنہ ھ، عربوں کی جنگی مہم سندھ پر۔ لیکن سات ابتدائی جلدوں کے علاوہ باقی جلدوں میں ابن اثیر نے ان تمام عربی ماخذوں سے جو انہیں دستیاب ہو سکیں، استفادہ کیا ہے۔ اس وجہ سے ان کی کتاب صحیح معنی میں اسلام کی سیاسی تاریخ ۶۲۸ھ تک کے لیے تمام مسلم مؤرخین کی تالیفات کا پورا خلاصہ تسلیم کی جاتی ہے۔

ابن اثیر ضبط مضامین اور احتیاطِ نقل میں بہت ممتاز ہیں۔ بلکہ اپنے ماخذ پر تنقید بھی کرتے ہیں۔ طبری، شہرستانی اور ان کے علاوہ دوسرے جن فضلاء اور مؤرخین پر انہوں نے نقل و اخذ کیا ہے اُن کے استدراکات بہترین ہیں۔

یاقوت حموی

شیخ شہاب الدین یاقوت حموی ۵۷۵ھ میں پیدا ہوئے اور ۶۲۶ھ میں وفات پائی۔ مشہور عرب تاجر عسکر بن ابی نصر الحموی کے آپ پہلے پہل غلام تھے اور پڑھا لکھا ہونے کے سبب حساب کتاب میں اس کے مددگار و معاون تھے۔ ۵۹۶ھ میں عسکر بن ابی نصر نے اُنہیں آزاد کر دیا اور اپنے محسن آقا سے جو تھوڑا بہت سرمایہ اُنہیں ملا اس سے یاقوت حموی نے تجارت شروع کر دی۔ کچھ تجارتی مجبوریوں کے تحت اور کچھ معلومات جمع کرنے کی غرض سے آپ دمشق، حلب، مرو، موصل، اور سنجار کے علاقوں کی خاک چھانتے پھرے۔ گو اُنہیں کسی ایک جگہ طمانیت و سکون سے ٹھہرنے کا موقع نہ ملا۔ لیکن مختلف دیار و امصار میں سیاحت کرنے سے مشاہدے میں قوت اور نظریات میں وسعت پیدا ہو گئی۔ مطالعہ کا انہیں بے حد شوق تھا۔ جس میں جگہ جگہ نقل مکانی کے باوجود کوئی خاص فرق نہ پڑا چنانچہ وہ خود لکھتے ہیں۔ ”مجھے مَرو کے قیام کے زمانے میں مختلف علوم و آداب اور ممتاز اربابِ فکر و نظر کی ایسی تصانیف ہاتھ آئیں، جنہوں نے مجھے بیوی بچوں کی یاد، اور دوستوں کے تعلّق خاطر اور آسائشوں کے خیال سے بالکل غافل کر دیا۔ یہاں (مرو میں)، گویا مجھے میری دولت گم گشتہ مل گئی۔ اور میری دیرینہ مراد بر آئی۔ میں ایک حریص انسان کی طرح ان کتابوں کے مطالعے میں مصروف ہو گیا۔“

یاقوت حموی کی تین تالیفات مشہور ہیں۔

(۱) معجم الادبا یا طبقات الادباء[1]

(۲) معجم البلدان

(۳) کتاب الشبہات

---

[1] اس کا ایک نام ارشاد الاریب الیٰ معرفتہ الادیب بھی ہے۔

معجم الادباء :-

یہ کتاب حروفِ تہجّی کے لحاظ سے مرتب کی گئی ہے۔ جس میں مسلمانوں کے تمام باکمال ادیبوں اور شاعروں کے اسمائے گرامی درج ہیں۔ پھر ان میں سے ہر ایک کا سنِ پیدائش اور سالِ وفات متعین کیا گیا ہے۔ اُن ادباء اور شعرا کے کلام کے نمونے بھی درج کیے گئے ہیں۔ یہ مواد محض کتابوں سے ماخوذ نہیں بلکہ بیشتر معلومات کا سرمایہ شہر شہر، قریہ قریہ، گھوم پھر کر جمع کیا گیا ہے۔ یہ امر مسلم ہے کہ یاقوت رومی نے کسی مرحلے پر بھی سُنی سُنائی باتوں پر اعتماد و یقین نہیں کیا۔ بلکہ جو کچھ لکھا۔ کمال تحقیق سے اور غایت درجہ ژرف نگاہی سے لکھا۔ پھر جن ادیبوں اور شاعروں کا انہوں نے تذکرہ کیا ہے وہ کسی ایک دور سے مخصوص نہیں بلکہ عالم اسلام کے تمام ادوار سے تعلق رکھتے ہیں۔ اسی طرح یہ تذکرہ کسی ایک شہر کے علماء و ادباء کے بارے میں محدود نہیں۔ بلکہ کوفہ، بصرہ، خراسان، حجاز، یمن، مصر، شام الغرض تمام بلادِ اسلامیہ کے مشاہیر کے سوانح کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوتے ہے۔ بلاشبہ ادیبوں اور شاعروں کے دوش بدوش نسابوں، مؤرخوں اور دوسرے مصنفوں کے بارے میں معجم الادباء ایک جامع قاموس کی حیثیت رکھتی ہے۔ اور آج بھی علماء ادباء اور شعرا کے سوانح حیات کے بارے میں ہماری معلومات کا سب سے بڑا ذریعہ یہی کتاب ہے۔ اس کتاب میں جن اصحابِ علم و دانش کے اسمائے گرامی اور مختصر سوانح حیات درج ہیں۔ اُن کی تعداد ایک ہزار کے لگ بھگ ہے۔ معجم الادبار کے شروع میں یاقوتِ حموی نے ایک فاضلانہ مقدمہ لکھا ہے جس میں انہوں نے سابقہ ادبار اور شعراء کے تمام تذکروں کو نا تمام بتایا ہے اور یہ دعویٰ کیا ہے کہ میری تالیف اہلِ نظر کے لیے سامانِ سیرابی بنے گی۔ چنانچہ لکھتے ہیں:-

"میں نے اس کتاب میں علمائے نحو و لغت، علمائے انساب، ممتاز قاریوں، علمائے تاریخ، معروف انشاء پردازوں اور مصنفوں سب کے حالات بڑے ایجاز سے جمع کر دیئے ہیں اور میں نے مشاہیر کی تاریخ ہائے پیدائش و وفات اور ان کی تالیفات کے تذکرے میں سرے سے کوئی کوتاہی نہیں کی۔ اِن مباحث کے دوش بدوش میں نے اُن اُدباء کے پسندیدہ احوال نیز ان کے منتخب اشعار اور ان کے درست نسب نامے بھی پیش کیے ہیں۔ جہاں تک اُن اُدباء کا تعلق ہے جن سے میں نے خود ملاقات کی ہے یا جن سے ملاقات کا شرف حاصل کرنے والوں سے مجھے ملاقات کی سعادت حاصل ہوتی ہے۔ ان کے احوال و حقائق تو میں نے اس طرح قلم بند کر دیئے ہیں کہ اس کے بعد آپ کو کسی چیز کو معلوم کرنے

کا شوق ہی باقی نہیں رہے گا۔ رہے وہ اُدبار، علمار اور فضلار جو مجھ سے پہلے گذر چکے ہیں تو ان کے حالات کی تحقیق کی میں نے مقدور بھر کوشش کی ہے۔ شہر بہ شہر اور ملک ملک کے طویل سفروں میں لوگوں سے مل کر جس حد تک میں تحقیق و تفتیش کر سکتا تھا میں نے اس میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔ میں نے ایسے اصحاب سے متعلق معلومات حاصل کرنے میں قابلِ اعتماد عُلمار (تذکرہ نویسیوں) کی کتابوں پر بھی بھروسہ کیا ہے۔

معجم البلدان :-

معجم البلدان علم جغرافیہ کے موضوع پر ایک بیش قیمت اور گراں قدر تالیف ہے۔ جیسے معجم الادبار کی طرح حروف تہجی کے لحاظ سے ہی ترتیب دیا گیا ہے۔ کتاب کے مقدمے (دیباچے) میں علم جغرافیہ کی اہمیت بیان کی گئی ہے۔ چنانچہ یاقوت حموی کے نزدیک عالم خواہ کسی مرتبے اور درجے کا ہو اُسے علم جغرافیہ کا جاننا اور سیکھنا ازبس ضروری ہے۔ چنانچہ وہ مقاماتِ حریری کی ایک عالمانہ اور ادیبانہ شرح کی مثال دیتا ہے۔ جو فصاحت و بلاغت کا نادر مرقّع ہے۔ لیکن جغرافیائی اغلاط کی وجہ سے سامانِ تمسخر بن کر رہ گئی ہے۔ اہلِ نظر کا خیال ہے کہ فاضل مؤلّف نے یہ تالیف انتہائی عرق ریزی سے مرتب کی ہے اور اس میں شہروں، دیہاتوں، ویرانوں، صحراؤں اور آبادیوں کے نام اور محل وقوع بڑی تحقیق و تفصیل سے لکھے ہیں۔ اس تالیف کے چھٹے جز میں بارہ ہزار سے زائد شہروں کے قبیلوں، نامور عورتوں اور مردوں کے نام آگئے ہیں۔ جس سے اس کتاب کی جامعیت اور اس کے مواد کے تنوّع کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

منجم العمران کے مؤلّف سیّد محمد امین الخانجی نے تو یاقوت کے بارے میں یہاں تک لکھ دیا ہے کہ اس دَور میں اگر کسی شخص کی نسبت علمی لغزشوں سے محفوظ رہنے کا بلا خوف تردید دعویٰ کیا جا سکتا ہے تو وہ صرف ابو عبداللہ یاقوتِ حموی کی ذاتِ گرامی ہے۔

نامور مغربی محقق جارج سارٹن "انٹروڈکشن ٹو ہسٹری آف سائینس" میں لکھتا ہے۔ معجم البلدان عربی ادب کے شہ پاروں میں سے ایک ہے۔ یہ نہ صرف علمِ جغرافیہ بلکہ تاریخ اقوام اور تاریخ فطرت کے متعلق معلومات کا بیش بہا خزینہ ہے۔

کتاب الشبہات :-

اس کتاب میں علامہ موصوف نے ایک ہی نام کے مختلف مقامات کا تذکرہ کیا ہے اور اُن کے فرق و امتیاز کو واضح کر دیا ہے۔ تاکہ بعد کے جغرافیہ نویس التباسِ ذہنی سے محفوظ رہ سکیں اور ان مقامات کے بارے میں مغالطے میں نہ پڑیں۔ اگرچہ بالعموم یاقوت حموی کو نامور جغرافیہ دانوں میں شمار کیا جاتا ہے لیکن جغرافیائی مباحث کے پہلو بہ پہلو انہوں نے جو تاریخی، عمرانی اور تمدّنی معلومات بہم پہنچائی ہیں وہ اُنہیں مؤرخین کی صفِ اوّل میں شامل کر دیتی ہیں۔

قاضی ابنِ خلکان

علامہ شمس الدین ابو العباس احمد بن ابراہیم ۶۰۸ھ میں اربیل کے مقام پر پیدا ہوئے۔ جو جزیرہ اربیل میں دجلہ کے مشرقی جانب واقع ہے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد بزرگوار سے حاصل کی۔ اس کے بعد ام المؤید زینب بنت عبدالرحمان اور ابن الصوفی جیسے فاضل اساتذہ سے تعلیم پائی۔ اپنے علم کی تکمیل کے لیے مختلف ملکوں کا سفر کیا۔ موصل میں کمال الدین موسیٰ بن یونس اور حلب بن الجواتی اور ابنِ شداد جیسے فُضلائے عصر سے استفادہ کیا۔ علامہ موصوف ۶۳۶ھ میں (قاہرہ میں) قاضی القضاۃ یوسف بن الحسن السنجاری کے نائب کی حیثیت سے مامور ہوئے اور ۶۵۹ھ میں دمشق کے عہدہ قاضی القضاۃ پر فائز ہُوئے۔ اپنے منصب سے سبکدوش ہونے کے بعد، قاہرہ کے مدرسہ الفخریہ، اور دمشق کے دارالعلوم مدرسہ الامینیہ میں درس و تدریس کے فرائض سرانجام دیتے رہے اور ماہِ رجب ۶۸۰ھ میں راہیِ ملکِ عدم ہوئے۔

ابن خلکان کئی کتابوں کے مؤلف تھے۔ لیکن ان کی کوئی تالیف دستبردِ زمانہ سے محفوظ نہ رہ سکی۔ ماسوا کتاب وفیات الاعیان، وانباء ابناء الزمان کے! جو دوسری صدی ہجری سے لے کر ساتویں صدی ہجری تک کے آٹھ سو پینسٹھ ۸۶۵ مشاہیر اسلام کے حالاتِ زندگی اور علمی خدمات کا نہایت جامع اور دلآویز مرقع ہے۔ فاضل مؤلف نے سلاطین وزراء، علماء، فقہاء، اُدباء، شُعراء غرضیکہ ہر طبقے کے صاحب کمال لوگوں کا جُدا جُدا تذکرہ سپردِ قلم کیا ہے۔ یہ تذکرہ کسی خاص شعبہ علم وفن کے اکابرین کے سوانح پر مشتمل نہیں۔ بلکہ اس میں ہر شعبہ حیات کے رہنماؤں اور پیشواؤں کے حالات کا ذکر ہے۔ اس لحاظ سے یہ تالیف عربی ادب میں اپنی طرز کی منفرد حیثیت کی حامل ہے۔

اس تالیف میں ہر ممتاز شخصیت کے سنِ پیدائش، جائے ولادت، سنِ وفات اور مقامِ وفات کی تصریح کی گئی ہے اور ان کے نسب نامے بھی درج کیے گئے ہیں۔ البتہ دینی علماء کا تذکرہ قدرے مجمل ہے، کیونکہ بقول مؤلف "ان کے محاسن و مناقب اظہر من الشمس تھے اور سابق مؤلفین ان کی توصیف کا حق

ادا کر چکے تھے۔"

ابن خلکان مشاہیر اسلام کی زندگیوں کا مکمل نقشہ پیش کرنے کی بجائے صرف وُہی پہلو سامنے لاتے ہیں جس سے اُن اکابرین کا کسی شعبۂ علم وفن میں امتیازی مرتبہ متعین ہو سکے۔ اس تذکرے کے مضامین کا تنوع بڑا حیرت انگیز اور اسلوبِ نگارش بڑا اثر انگیز ہے۔ اس سے پہلے (اسی نہج پر) جو تذکرے مرتب کیے گئے تھے۔ وُہ صرف علمائے دین، بالخصوص مفسرین ومحدثین کے بارے میں تھے۔ اور وہ تذکرے زندگی کے دُوسرے شعبوں کے اکابرین کے بارے میں ساکت وصامت تھے۔

قاضی صاحب نے اپنی کِلک گہر بار سے شخصیات کا جو مرقع پیش کیا ہے اُس کی وجۂ تالیف خود ان کی اپنی زبانی سُنئے۔ فرماتے ہیں۔ "مجھے مؤلفین کے سلسلے کے ساتھ وابستہ ہونے کا سرے سے کوئی شوق نہیں۔ عربوں میں یہ ضرب المثل زبان زدِ خاص وعام ہے کہ ہر کام کے لیے خاص لوگ ہوا کرتے ہیں۔ مجھ میں یہ وصف کہاں؟ میری استعداد اس علم (تاریخ نگاری) میں بہت محدود ہے"۔

آگے چل کر لکھتے ہیں۔ "شروع شروع میں مجھے صرف چند شعبوں کے مشاہیر کی تاریخِ ولادت اور سنِ وفات معلوم کرنے کا اشتیاق تھا۔ میں نے اس سلسلے میں کچھ مواد جمع کرنا شروع کیا لیکن ضرورت کے وقت اس مواد سے بے ترتیبی کے باعث فائدہ اُٹھانا ازحد مشکل معلوم ہوا۔ پس میں نے جمع شدہ مواد کو حروفِ تہجی کے مطابق ترتیب دینا شروع کر دیا اور اس طرح یہ مستقل کتاب معرضِ وجود میں آ گئی۔ جو میرے بعد دنیا میں میرے علمی کارنامے کی حیثیت سے زندہ و یادگار رہے گی"۔ حُسنِ اتفاق سے مصنف کا ذاتی قلمی نسخہ برٹش میوزیم میں محفوظ ہے۔

وفیات الاعیان میں سوانح نگاری کا بڑا حسین اسلوب اختیار کیا گیا ہے جس میں نہ صرف خاص ادوار کی نامور ہستیوں کی شخصیت کے نامعلوم گوشوں کو کمال ہنرمندی سے اُجاگر کیا گیا ہے۔ بلکہ اس محققانہ تالیف سے اس وقت کی مختلف مذہبی، سیاسی، علمی اور فکری تحریکات کے بارے میں وسیع معلومات حاصل ہو جاتی ہیں۔ ہم یہاں قارئین کی دلچسپی کے لیے ابن خلکان کی تذکرہ نگاری کی تین مثالیں پیش کرتے ہیں

(۱) اوّل نظام الملک طوسی کے بارے میں فاضل مؤلف یوں رقم طراز ہے" کہ مسلمانوں کی تاریخ میں وہ پہلے وزیرِ اعظم تھے جنہوں نے ایک عظیم دارالعلوم کا سنگِ بنیاد رکھا اور ان کی داد و دہش سے

مملکت کے خزانے پر خاصا بوجھ پڑا۔

(۲) اموی خلیفہ الحکم کی بابت لکھتے ہیں کہ وہ تمام بلادِ اسلامیہ سے مسلمان علماء کو سرزمین اندلس میں مدعو کرتا تھا۔ جس میں ایک مشہور مورّخ ابن قوتیہ ہے۔

(۳) سوئم سلطان نوح منصور سے متعلق فاضل تذکرہ نگار لکھتا ہے کہ بخارا کے اس سامانی رئیس کے ہاں تقریباً تمام علوم کے متعلق نایاب کتابیں خصوصاً علم فلسفہ کے موضوع پر موجود تھیں۔

اس تالیف میں اوّل تا آخر فاضل محقق نے متقدمین و معاصرین کی تاریخی کتابوں سے جابجا حوالے دیئے ہیں۔ جس سے ہمیں ابن خلّکان کے سرمایۂ علم کے مآخذ بھی معلوم ہوجاتے ہیں اور اس کی تالیف کو درجۂ استناد بھی حاصل ہوجاتا ہے۔

فاضل مؤلف کے علمی رتبے کے بارے میں حافظ قطب الدین اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں کہ "وہ امامِ وقت تھے اور بہترین ادیب تھے۔ اپنے فرضِ منصبی کو عدل و انصاف سے سرانجام دیتے رہے۔ اور بہت اچھے مورّخ تھے۔ حافظ ابو محمد برزالی رقم طراز ہیں "ابن خلّکان اپنے دور کے جیّد عالم اور نامور فاضل تھے۔ انواع و اقسام کے علوم مثلاً علم فقہ، علم تاریخ اور علم لغت پر پوری دسترس رکھتے تھے۔ علامہ شہاب الدین محمود معترف ہیں، کہ مجھے علاّمہ موصوف سے مستفید ہونے کا شرف حاصل ہے"۔ مورّخ ابوالمحاسن نے اپنی تالیف "المنہل الصافی" میں آپ کو بھرپور خراجِ تحسین پیش کیا۔ مورّخ حاجی خلیفہ چلپی وفیات الاعیان کو لافانی کتابوں میں شمار کرتے ہیں۔ مشرق و مغرب کی کئی زبانوں مثلاً فارسی، انگریزی فرانسیسی میں اس تالیف کے کئی تراجم شائع ہوچکے ہیں۔ اس تالیف کے بعض اربابِ علم نے حواشی و تشریحی نوٹ قلم بند کئے اور بعض اہل نظر نے اس کی تلخیصات مرتب کی ہیں۔ مزید براں بعض مورخین اور تذکرہ نگاروں نے اس تالیف سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔

اقتباسات از مقدمۂ "وفیات الاعیان"

آخر میں ابن خلکان کی تالیف "وفیات الاعیان" کے فاضلانہ مقدمے سے چند اقتباسات "فَذَکِّرْ" کے طور پر ہدیۂ قارئین کیے جاتے ہیں۔

"مجھے نامور متقدمین کے حالات معلوم کرنے کا بڑا شوق تھا اور یہ جاننے کی آرزو تھی کہ

ان کی تاریخِ ولادت اور تاریخِ وفات کیا کیا ہیں ؟ اور ان میں سے کون کون اکابر ایک ہی زمانہ میں پیدا ہوتے ہیں۔ جس سے میرے پاس خاصا مواد جمع ہو گیا اور یہ رغبت پیدا ہوئی کہ اس میں اور اضافہ کیا جائے اور تحقیق و جستجو میں دل لگایا جائے۔ چنانچہ میں نے ان کتابوں کے مطالعہ کی طرف توجہ کی جو خاص اس فن میں لکھی گئی تھیں اور جو جو باتیں نہ ملیں اُنہیں اس فن کے کاملین سے زبانی دریافت کیا اور اس کے سوا چند مضامین میرے حافظہ میں موجود تھے۔ اب یہاں تک نوبت پہنچ گئی کہ ان میں سے کسی شی کی جانب رجوع کی حاجت پڑتی تو اس مواد کے غیر مرتّب ہونے سے مجھے وہ اس وقت ملتے کہ جب ان کے نکالنے میں بہت زیادہ محنت کی جاتی مجبوراً مجھے اس سرمایۂ علم کو ترتیب دینا پڑی میں نے دیکھا کہ سال وار ترتیب دینے سے حروف تہجّی کے موافق ترتیب دینا بہتر ہے۔ اس میں زیادہ تر آسانی ہے۔ چنانچہ میں نے یہی دوسرا اسلوبِ تدوین اختیار کیا۔"

"میں نے اس تالیف میں صحابہ کرام اور رسول اکرمؐ کے احوال قلم بند نہیں کیے۔ ماسوا چند بزرگوں کے حالات کے! جنہیں جاننے کی اکثر لوگوں کو ضرورت درپیش ہوتی ہے۔ اور اسی طرح خلفائے عظام میں سے میں نے کسی کا ذکر نہیں کیا۔ کیونکہ اس باب میں بہت سی کتابیں موجود ہیں۔"

پھر میں نے اپنے اس مختصر رسالے کو کسی مخصوص طبقے مثلاً علماء، ملوک، اُمراء، وُزراء، شعُراء کے بیان پر محدود نہ کیا بلکہ میں نے جس کسی اتنا معروف پایا کہ لوگ اس کے حالات جاننے کا اشتیاق رکھتے ہیں تو میں نے اس کا ذکر کر دیا (خواہ وہ کسی گروہ یا طبقے سے ہو) بیان میں ایجاز و اختصار اس لیے ملحوظ رکھا تاکہ کتاب زیادہ طویل نہ ہو جائے۔

میں نے اس کتاب کو بمقام قاہرہ ۶۵۴ھ میں مرتّب کیا ہے حالانکہ کثرتِ مشاغل اور ہجومِ افکار میں گھرا ہوا تھا اور ایسے حالات میں سے گذر رہا تھا کہ اس قسم کے علمی کام انجام دینا مشکل تھا۔

یاد رکھیے! مجھے یہ کتاب ایک خاص ضرورت کے تحت مرتّب کرنا پڑی۔ یہ بات نہیں کہ میرے دل میں مؤلفین کے سلسلہ میں منسلک ہونے کا شوق چٹکیاں لے رہا ہو۔ عربوں میں مثل مشہور ہے کہ ہر کام کے لیے خاص لوگ ہوا کرتے ہیں۔ مجھ میں یہ بات کہاں ؟ میری بضاعت تو اس علم میں بڑی قلیل ہے۔

ابن خلکان کی تالیف "وفیات الاعیان" پر یہ اعتراض اُٹھایا گیا ہے کہ فاضل مصنّف نے اکابر مفسّرین، محدّثین اور فقہاء کے سوانح حیات چند سطور میں بڑے اختصار سے قلمبند کی ہیں درآنحالیکہ جب وہ کسی ادیب یا شاعر کے حالات لکھتے ہیں تو صفحوں کے صفحے سیاہ کر ڈالتے ہیں۔ اس سلسلہ میں حاجی خلیفہ (جس نے چھبیس ۲۶ ضخیم جلدوں میں وفیات الاعیان کا ذیل لکھا ہے) نے ابن خلکان کا عادلانہ دفاع کیا ہے۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ ناقدین حضرات، اور نکتہ چین اصحاب کو ابن خلکان کی اس بلند پایہ تالیف کی اس نمایاں خوبی پر نظر رکھنی چاہیئے کہ اس سے پہلے ہر شعبۂ حیات کے اکابر کی قاموس مرتّب کرنے کا خیال ابن خلکان سے پہلے کسی کے ذہن میں نہ آیا تھا۔ ابن خلکان کی تالیف میں یہ خامیاں ہو سکتی ہیں لیکن جب یہ بات ذہن نشین کر لی جائے کہ عربی ادب کے صدیوں پر پھیلے ہوئے سلسلے کے بارے میں یہ پہلی تصنیف ہے تو اس کی خامیوں کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ مفسّرین، محدّثین، فقہاء کرام اتنے معروف و ممتاز تھے کہ بچہ بچہ ان کے بارے میں علم رکھتا تھا۔ ان کے محاسن و مناقب آفتاب عالم تاب کی طرح چمک رہے تھے۔ جس کی درخشانی و تابانی سے عالم اسلام کا گوشہ گوشہ روشن تھا۔ مزید یہ کہ ان کے بارے میں پہلے بہت کچھ لکھا جا چکا تھا۔

پھر ابن خلکان کا حروفِ تہجی کے اعتبار سے قاموس مرتّب کر دینا مصنّف کی جدّت طرازی اور تصنیف کی اضافی خوبی ہے۔ مثلاً ابن ندیم کی کتاب الفہرست جو چھ ابواب پر مشتمل ہے۔ نہ حروفِ تہجی کے مطابق مرتّب ہوئی ہے نہ ماہ و سال کے حساب سے اُسے قلم بند کیا گیا ہے۔

ابنِ طقطقی

محمد علی بن علی بن طبا طبا جنہیں ابن طقطقی کے نام سے شہرت حاصل ہے، ۶۶۰ھ میں پیدا ہوئے وہ پہلے مسلمان مؤرخ ہیں، جنہوں نے تاریخ نگاری میں، مقدمہ تاریخ لکھنے کے اسلوب کو رواج دیا۔ اس اندازِ نگارش کی ابنِ خلدون ایسے نامور مؤرخ نے بعد میں تقلید کی۔ (گرچہ ابن طقطقی کی تالیف سے ابن خلدون کے مقدمہ کی علمی شان بڑی بلند ہے) انہیں کم عمری ہی میں سیاحت کا شوق تھا۔ چنانچہ مراغہ اور بغداد کی سیر وسیاحت کی پھر تبریز کا سفر اختیار کیا۔ موسم کی خرابی اور برفباری کی شدت سے موصل میں مجبوراً ٹھہر گئے۔ جہاں انہوں نے ۷۰۱ھ میں اپنی مشہور کتاب "الفخری" تصنیف کی، جو انہوں نے سلطان غازان خان کے صوبے دار (موصل) فخرالدین عیسیٰ کے نام نامی پر معنون کی ہے۔ اس کتاب کا پورا نام "الفخری فی الآداب السلطانیہ والدول الاسلامیہ" ہے اس کتاب کا مقصدِ تالیف خود فاضل مؤلف کے الفاظ میں یہ تھا۔ کہ "فخرالدین عیسیٰ اسے اپنی سلطنت کا آئین اور لائحہ عمل سمجھے اور مصنف خواہ اس واجب التعظیم حاکم کی صحبت و حضوری میں رہے یا اس کی وسیع قلم رو سے باہر چلا جائے۔ دونوں صورتوں میں یہ تالیف اس کی یادگار کا ذریعہ بنے۔

اس تالیف کے مقدمے میں امور سلطانی اور سیاسیات ملکی پر علم تاریخ کی روشنی میں مفصّل بحث کی گئی ہے۔ حاکمِ اعلیٰ۔ (الملک الفاضل) کے اوصاف اور فرائض، راعی اور رعایا کے تعلقات کی نوعیت، سفیروں اور دوسرے اہم عہدیداروں کی معزولی و بحالی، مملکت کے مالی اور عسکری نظام، ان سب امور کے بارے میں نہایت بیش قیمت معلومات پیش کی گئی ہیں۔ مزید برآں اس تاریخی سرمائے کو آیاتِ قرآنی، احادیثِ نبوی، ضرب الامثال، حکیمانہ اقوال اور اثر انگیز اشعار کے برمحل اقتباسات کے نگینوں سے مزیّن کیا گیا ہے۔ اسلامی علم السیاست کے نہایت اہم مسائل کو تاریخی واقعات کی روشنی میں بڑی وضاحت سے پیش کیا گیا ہے۔ تاہم سردست ہمیں کتاب کے اس حصے سے کچھ زیادہ سروکار نہیں جو ابن طقطقی کے علم السیاست میں غیرمعمولی

بصیرت کا آئینہ دار ہے۔

کتاب کے دُوسرے باب میں خلافت راشدہ سے لے کر المعتصم باللہ کے قتل، اور بغداد کی تباہی و بربادی تک کے حالات کا نہایت خوش اسلوبی سے جائزہ لیا گیا ہے۔ آلِ عباس کے دوش بدوش دیالمہ، سلاجقہ، فاطمین مصر اور ایوبی خاندان کے حالات اختصار سے بیان کیے گئے ہیں۔

تاریخی مباحث کا بیشتر مواد ابن اثیر کی تاریخ "الکامل" اور ابو بکر محمد بن یحییٰ الصولی کی تاریخی تصنیف "کتاب الوزراء" سے اخذ کیا گیا ہے اور اس میں عباسی خلفاء کے حالات کے پہلو بہ پہلو وُزرائے حکومت کا تفصیلی ذکر موجود ہے۔ حماسہ، مقامات بدیع الزمان ہمدانی، نہج البلاغۃ اور کتاب الیمینی سے بھی اخذ و اقتباس کیا گیا ہے۔

تاریخی واقعات اور حقائق کے بیان میں فاضل مؤرخ نے دو ضابطوں کی پابندی کی ہے۔ اوّل یہ کہ واقعات کا بیان و تجزیہ کرنے میں جذبات کی رَو میں بہنے کی بجائے انصاف، حق گوئی اور راستبازی سے کام لیا جائے۔ دُوسرے یہ کہ خطیبانہ سُخن آرائی کی بجائے سہل و دلنشین انداز بیان اختیار کیا جائے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ فاضل مؤلف نے تاریخ نگاری کے ان ہر دو اصولوں کی پاسداری کا حق خوب ادا کیا ہے۔ تاریخی واقعات کی تحقیق کا انداز غیر جانبدارانہ ہے۔ نیز تاریخی روایات کو پیش کرنے کا اسلوب کافی حد تک منصفانہ اور ذمہ دارانہ ہے۔ مثلاً منگول حکمرانوں کے بارے میں ان کا طرز بیان اگرچہ مدح و ستائش کا رنگ لیے ہوئے ہے لیکن خاصا مُحتاط و متوازن ہے۔ عباسی خانوادے کے بارے میں ان کی رائے بھی نہایت صائب ہے۔ اور ابتدائی دَور کے عباسی حکمرانوں کی خوبیوں اور آخری دَور کے خلفاء کی خامیوں دونوں پر بے لاگ اور غیر جانبدارانہ تبصرہ کیا گیا ہے۔ چنانچہ عباسی خاندان کے عیوب و محاسن دونوں پر بحث کرنے کے بعد یوں محاکمہ کرتے ہیں۔ "باوجود اِن سب عیوب کے خلفائے عباسیہ نے بڑے اچھے کام کیے، وہ فیّاض تھے، اُن کے زمانے میں علوم کی گرم بازاری تھی۔ تہذیب و ثقافت کی چمک دمک تھی۔ شعائرِ دین کی حُرمت کی جاتی تھی۔ بھلائی کے کاموں کی کثرت تھی۔ دارالاسلام کی سرحدیں محفوظ تھیں۔ یہ صورت آخری دَور تک رہی۔ حتیٰ کہ عدل و انصاف گھٹنے لگا اور امن میں خلل پیدا ہوا اور حکومت دوسرے ہاتھوں میں منتقل کر دی گئی۔"

بلاشبہ کتاب الفخری نے سیاسی شعور کو بیش قیمت مواد فراہم کیا۔ تاریخ نگاری میں فلسفیانہ

تفکر، حق گوئی و بے باکی اور غیر جانبداری کی اعلیٰ روایات کو فروغ دیا۔ یہاں یہ کہنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مشرق سے زیادہ مغربی ممالک میں اس کتاب کو مقبولیت نصیب ہوئی۔ اس کا قدیم ترین نسخہ پیرس کی لائبریری میں ہے۔ جس پر جرمن زبان میں علمی ملاحظات (COMMENTS) کا اضافہ کیا گیا ہے۔ فرانسیسی زبان میں ایمل ایمر نے اور انگریزی زبان میں اے جی وہائی ٹنگ نے اس کا ترجمہ کیا۔ مشرقی زبانوں میں سے فارسی زبان میں اس کا ایک ترجمہ "حصہ تجارب السلف" کے نام سے چھپ چکا ہے۔ ۱۳۱۷ھ میں مصر میں یہ کتاب عربی میں طبع ہوئی اور اردو زبان میں اس کا پہلا ترجمہ محمد جعفر شاہ پھلواری نے پیش کیا۔ آخر میں یہ بتانا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کہ "کتاب الفخری" کا انداز بیان اوّل تا آخر حد درجہ سلیس اور واضح ہے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ پروفیسر براؤن نے اپنی "تاریخ ادبیاتِ ایران" میں لکھا ہے کہ اُس کی دانست میں قرآن حکیم کے بعد "الفخری" سے بہتر کوئی کتاب نہیں جس کے ذریعہ مبتدیوں کو عربی ادب سے روشناس کروایا جا سکے۔

○

ابوالفداء

عمادالدین ابوالفداء اسماعیل بن علی ایوبی سلطانِ مصر کی طرف سے شہر حماۃ (واقع شام) کے حاکم تھے جنہوں نے علم وفضل کے ماحول میں آنکھ کھولی۔ آسودگی وخوش حالی کے دامن میں پرورش پائی۔ مروجہ علوم میں کامل دستگاہ حاصل کی۔ تاریخ وھیئت میں لازوال شہرت پائی۔ سلطانِ مصر ملک ناصر بن خلدون نے تاتاریوں سے شجاعانہ معرکہ آرائیوں کی بدولت اُنہیں حماۃ کا حاکم مقرر کیا اور "الملک المؤید" کے لقب سے سرفراز کیا۔ ابوالفداء کا نام، رعایا کی خبرگیری، علماء کی پشت پناہی اور علم کی سرپرستی اور اپنی غیر معمولی شجاعت وبسالت، محققانہ تالیفات کی کثرت کی وجہ سے تاریخ اسلام میں سُنہری حُروف سے لکھے جانے کے قابل ہے۔

ابوالفداء نے تاریخ اور جغرافیہ کے علوم پر دو معروف کتابیں سپردِ قلم فرمائی ہیں۔ تاریخ ابوالفداء یا المختصر فی اخبار البشر عربوں کی عمومی تاریخ ہے۔ اقوامِ قدیمہ کے مختصر تاریخی حالات کے بعد ظہورِ اسلام سے لے کر ۷۲۹ھ تک ملتِ اسلامیہ کے سیاسی وتمدنی واقعات کا سنین وار دلچسپ حال سپردِ قلم کیا گیا ہے۔ اس کتاب کے مطالعے سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ابوالفداء نے یہ گراں قدر تالیف بیس سے کچھ اُوپر کتابوں کو سامنے رکھ کر بطورِ خلاصے کے مرتب کی ہے اور اس سلسلہ میں فاضل مصنف نے خاص التزام ملحوظ رکھا ہے کہ پیش رو مصنفین کی تمام تالیفات کی اہم معلومات منتخب کرلی جائیں اور کوئی غیر ضروری واقعہ نہ درج ہونے پائے۔ اِس طرح اُنہوں نے "گلہائے خنداں" کا ایک ایسا گلدستہ تیار کر دیا ہے جس کی تازگی اور شادابی تادیر قائم رہے گی۔ عمادالدین ابوالفداء نے اپنی اس گراں مایہ تالیف میں تاریخ نگاری میں ابنِ جریر طبری اور ابنِ اثیر جزری کے اسلوبِ تدوین کو اختیار کیا ہے اور تمام واقعات وحقائق، سنین وار جمع کیے ہیں۔

یہاں یہ امر بیان کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ عربوں کے ہاں تاریخ نویسی کے دو جداگانہ ڈھنگ رہے ہیں۔ ایک طریقِ تدوین یہ تھا کہ کوئی سَن درج کرکے۔ اس کے تحت تاریخی واقعات درج کر دیئے جائیں خواہ وہ کسی مقام پر اور کسی علاقے میں پیش آئے ہوں۔ اس کی نمایاں مثال ابنِ جریر طبری، ابنِ اثیر اور ابوالفداء کی تالیفات ہیں۔ تاریخ کو مرتب کرنے کا دُوسرا ڈھنگ یہ تھا کہ قوموں اور حکومتوں کی تاریخ اُن کے ادوار

کی ترتیب کے لحاظ سے لکھی جاتے۔ اس اسلوب کو علامہ مسعودی، ابن طقطقی اور ابن خلدون نے اپنایا۔ پیشرو مؤرخین کے سرمایۂ علم سے اخذ وانتخاب کرنے میں ابوالفداء نے غیر معمولی مؤرخانہ بصیرت اور تنقیدی شعور سے کام لیا ہے اور روایت کی جانچ پڑتال میں بڑی کاوش کی ہے۔ اسی طرح واقعات وحوادث کو کو نقل کرنے میں انہوں نے دیانت وصداقت کا ثبوت دیا ہے۔ چونکہ ابوالفداء ادب، فلکیات، فقہ، تاریخ جغرافیہ جیسے علوم میں کمال درک رکھتے تھے۔ اور سیاسی اور عسکری فنون کی عملی تربیت حاصل کر چکے تھے۔ اس لیے ان کی تاریخ کے دائرے میں یہ سارے علوم آجاتے ہیں[۱]۔ مضامین ومباحث کا تنوع قابل ستائش ہے اور اضافی خوبی یہ ہے کہ واقعات کے بیان میں دلچسپی کے سررشتے کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔

اس تالیف کو متقدمین اور متاخرین نے ہمیشہ قدر واحترام کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ چنانچہ الوردی نے تاریخ ابی الفداء (المختصر فی اخبار البشر) کا ذیل لکھا اور اس کے واقعات کا سلسلہ ضروری اضافوں کے ساتھ ۷۴۹ھ تک پھیلا دیا۔ یوروپ میں یہ تالیف پہلے پہل لاطینی ترجمے کے ساتھ چھپی۔ بعد ازاں مصر سے چار جلدوں میں شائع ہوئی اور ۱۸۴۶ء میں مولوی کریم بخش نے اس کمیاب ونایاب تالیف کا اردو ترجمہ کرنا شروع کیا مگر یہ ترجمہ نامکمل رہ گیا۔ ابوالفداء نے اپنی دوسری تالیف جغرافیہ اور فلکیات کے موضوع پر "کتاب تقویم البلدان" مرتب فرمائی۔ جس میں انہوں نے ان ہر دو فنون میں قدماء کے تمام مباحث کا خلاصہ جامع مانع انداز میں پیش کر دیا۔ اگر خلاصہ نگاری کوئی فن ہے تو بلاشبہ ابوالفداء اس فن کے امام الائمہ ہیں۔ مزید براں علامہ موصوف جغرافیائی اسماء کا صحیح تلفظ ضبط تحریر میں لائے ہیں۔ انہوں نے مختلف شہروں کے طول وعرض کی خوب خوب تحقیق فرمائی ہے۔ بالخصوص شام، بلادِ عرب، اور ایران کے اہم مقامات کے بارے میں نادر معلومات فراہم کی ہیں۔

احمد حسن زیات نے اپنی فاضلانہ تالیف "تاریخ ادب عربی" میں بجا طور پر لکھا ہے: "ابوالفداء کی تاریخ اور جغرافیہ کے موضوع پر دو کتابیں ہیں جو ان دونوں علوم میں عربوں اور یوروپ والوں کے لیے مرجع و سند رہی ہیں۔"

---

[۱] ان علوم پر فاضل مؤلف نے متعدد کتابیں الگ لکھی ہیں۔

علامہ ذہبی

ابو عبداللہ محمد بن احمد المعروف علامہ ذہبی ساتویں صدی ہجری کے عظیم مؤرخ اور یکتائے روزگار محدث ہیں۔ آپ ۶۷۳ھ میں میافارقین (دمشق کے گاؤں) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم دمشق میں ہی پائی۔ پھر شام کے بڑے بڑے شہروں مثلاً بعلبک، حلب، نابلس، اسکندریہ اور قاہرہ کے جید علماء سے کسب فیض کیا۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد علامہ موصوف نے اپنی تمام تر توانائیاں تعلیم و تدریس اور تصنیف میں صرف کر دیں۔ مؤرخین لکھتے ہیں کہ آخری عمر ۷۴۳ھ میں ان کی بینائی جاتی رہی۔ اور ۷۴۸ھ میں انہوں نے وفات پائی۔ کثیر التصانیف ہونے کے باعث ارباب علم و فضل نے اُن کے سر پر علامہ کا تاج رکھا اور علم حدیث میں سرآمدِ زمانہ ہونے کے سبب وہ "حافظ الحدیث" کہلاتے۔

علامہ ذہبی نے فنِ تاریخ میں ایک ضخیم کتاب تاریخ الاسلام وطبقات المشاہیر لکھی ہے جس میں عہد اسلامی سے لے کر ۷۰۰ھ تک کے سیاسی حالات مذکور ہیں۔ ابنِ جوزی کی المنتظم فی تاریخ الامم کے انداز پر مختلف تاریخی ادوار کے تحت تاریخی واقعات کے دوش بدوش مشاہیر علم و ادب کے وفیات اور مختصر سوانح درج کیے گئے ہیں۔ خصوصاً محدثین کے سوانح کے بیان میں شرح و بسط کا اہتمام کیا گیا ہے۔ چونکہ علامہ موصوف اسناد کے اسقام و علل (نقائص) پر گہری نظر رکھتے تھے اس لیے انہوں نے صرف ایسے تاریخی واقعات کو منتخب کر کے درج فرمایا ہے جو روایت کے اصولوں کے مطابق تھے اور بہت سی ایسی روایات قلم انداز فرما دی ہیں جو ان کے معیار پر پوری نہ اُتر سکیں۔

علامہ ذہبی مطولات (بڑی ضخیم کتابوں) کے اختصار میں خاص ملکہ رکھتے تھے۔ اس فن کی متعدد تصانیف مثلاً مختصر المستدرک، اختصار تاریخ بغدادی اور اختصار تاریخ ابنِ عساکر اس کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ یہی اختصار نویسی کا اسلوب اُن کی تاریخ اسلام کی بھی جان ہے۔ اگرچہ علامہ ممدوح نے پہلی چھ صدیوں کا مواد اپنے پیش رو قابلِ اعتماد مؤرخین سے اخذ کیا ہے۔ لیکن ساتویں صدی کے بارے میں مواد جمع کرنے میں ان کی ذاتی سعی و کوشش کا دخل ہے۔ اِن تمام خوبیوں کے باوجود علامہ موصوف

صوفیائے کرام، شافعی اور حنفی فقہائے عظام اور اشاعرہ متکلمین کے بارے میں تنقید فرماتے ہوئے کہیں کہیں جادۂ اعتدال سے ہٹ گئے ہیں۔ اور علامہ سخاوی کے الفاظ ہیں "ان کی غیر جانبداری اور بے تعصبی کی مؤرخانہ شان مجروح ہو گئی ہے۔"

تاریخ الاسلام وطبقات المشاہیر کی ان خصوصیات پر ہم علامہ ذہبی کے ان اشارات کا اضافہ کرنا چاہتے ہیں جو انہوں نے اس تالیف کی تمہید میں درج فرمائے تھے۔ علامہ موصوف لکھتے ہیں۔

"میں نے اس کتاب کے جمع کرنے میں بڑی کاوش صرف کی ہے اور اس کو متعدد ایسی تصانیف سے اخذ کیا ہے جن کی بدولت انسان کو ماضی کا علم حاصل ہوتا ہے۔ یعنی تاریخِ اسلام کے آغاز سے لے کر ہمارے اس دور تک بڑے بڑے خلفاء، قرّاء، زہّاد، فقہاء، محدّثین، علماء، سلاطین، وزراء، نحویین اور سب کی وفات کی تاریخوں کا علم اور مختصر عبارت اور چند الفاظ میں اُن سے متعلقہ اخبار (معلومات) مشہور فتوحات، یادگار لڑائیوں اور قابلِ تحریر عجیب واقعات کا علم، میں دراز کلامی اور طول نویسی سے دامن بچاتے ہوئے صرف ان لوگوں کا ذکر کروں گا جو مشہور و معروف ہیں۔ لیکن اُن لوگوں کا ذکر چھوڑ دوں گا جو گمنام یا نسبتاً غیر معروف ہیں اور صرف بڑے بڑے واقعات کی طرف اشارہ کروں گا۔ اس لیے کہ اگر میں ایک ایک کرکے تمام سوانح اور واقعات کو لوں تو کتاب سو بلکہ اس سے بھی زیادہ جلدوں میں پھیل جائے گی۔ اس میں ایسی ہستیوں کا ذکر ہے کہ اگر میں چاہوں تو ان کے حالات پچاس جلدوں میں بیان کر سکتا ہوں۔"

علامہ ذہبی نے فنِ تاریخ پر ایک کتاب "الدّول الاسلامیہ" بھی مرتب فرمائی تھی۔ لیکن وہ اُن کی اپنی مرتب کردہ تاریخ اسلام ہی سے ماخوذ ہے۔ اور اسی کا ملخّص ہے۔

حافظ ذہبی نے حدیث کے حفّاظ اور رجال کے بارے میں کئی تالیفات سپردِ قلم فرمائی ہیں۔ جن میں "تذکرۃ الحفاظ" کو دوامی شہرت نصیب ہوئی۔ علامہ جلال الدین سیوطی جیسے نامور محقق و مؤرخ نے اس کی تلخیص (طبقات الحفاظ) مرتّب فرمائی ہے۔ اس تالیف میں محدّثین کے طبقات و مدارج کا بیان ہے۔ طبقۂ اُولیٰ میں علامہ موصوف نے صحابہ کرام (خصوصاً جن سے زیادہ مرویات پہنچی ہیں، یعنی مکثرین) کا ذکر فرمایا ہے۔ مثلاً ابوہریرہؓ۔ عبداللہ بن عمرؓ، انس بن مالکؓ، حضرت عائشہؓ، عبداللہ بن عباسؓ اور جابر بن عبداللہؓ۔

طبقۂ دوم، طبقۂ سوم اور طبقۂ چہارم میں علامہ ذہبی نے ایک سو تئیس تابعین کا ذکر کیا ہے جن کے سینوں کو وہ علوم و معارف کا گنجینہ قرار دیتے ہیں۔ طبقۂ پنجم میں علامہ ذہبی نے صف اوّل کے ستّر سے زائد آئمہ حدیث کا ذکر کیا ہے۔ اس ضمن میں انہوں نے بعض عباسی خلفاء کے کردار پر بھی جامع الفاظ میں تبصرے کیے ہیں۔ مثلاً ابو جعفر ظالم ہونے کے باوصف شجاعت، حوصلہ مندی اور بیدار مغزی میں لاثانی تھا۔ مہدی محاسنِ اخلاق سے آراستہ ہونے اور زندیقوں کا استیصال کرنے میں اپنی مثال آپ تھا۔ ہارون الرشید لہو و لعب میں پڑ جانے کے باوصف علم دوستی اور علماء پروری میں عدیم النظیر تھا۔ حافظ ذہبی کے علمی مرتبے کا اندازہ اس امر سے کیا جا سکتا ہے کہ علامہ شمس الدین سخاوی جیسا محقق مورخ انہیں الحافظ، الاستاذ، الامام کے القابات سے یاد کرتا ہے۔

الذہبی کے بعد علم حدیث کی کتابوں کا رواج عام ہوتا چلا گیا اور حفظِ حدیث میں پہلے کا سا ذوق و شوق باقی نہ رہا۔ چنانچہ شہاب خفاجی متوفی (۱۰۶۹ھ) اپنی شرح شفا میں لکھتے ہیں:۔

"حافظ قاضی عیاض نے ہر اس شخص کے حالات و صفات بیان فرمائے ہیں جس نے حدیث کی زیادہ روایت کی ہے اور انہیں عمدگی سے محفوظ رکھا ہے۔ لیکن اب ہمارے زمانے میں یہ سلسلہ منقطع ہو چکا ہے اور حفاظ و محدثین کی آخری یادگار حافظ سیوطی (متوفی ۹۱۱ھ) اور حافظ سخاوی (متوفی ۹۰۲ھ) رہ گئے ہیں۔

ابنِ کثیر

ابن کثیر عماد الدین ابو الفداء اسماعیل بن کثیر کا عظیم مرتبہ، مفسّر، محدّث اور مؤرخ کی حیثیت سے ہر زمانے میں تمام اُمت میں مسلّم رہا ہے۔ علامہ ممدوح سنہ ۷۰۱ھ میں بصرہ میں پیدا ہوئے۔ سات سال کی عمر میں اپنے بھائی کے ساتھ دمشق میں تحصیلِ علم کے لیے آئے۔ جہاں انہوں نے فقہ، اصول فقہ، تاریخ اور دوسرے مروجہ علوم میں کامل دستگاہ حاصل کی۔ وہ ابن تیمیہ حنبلی کے شاگردِ خاص تھے اور مصائب و آلام جھیلنے میں خندہ پیشانی سے ان کے شریک رہے۔ بلکہ وفات کے بعد اپنے استاذِ گرامی کے مرقد کے قریب مدفون ہوئے۔

امام ابنِ کثیر کی پہلی قابلِ ذکر تالیف تفسیر ابن کثیر ہے جو صاحب کشف الظنون کے بیان کے مطابق دس جلدوں پر مشتمل ہے یہ تفسیر بالاحادیث و الآثار ہے۔ یعنی ہر آیتِ قرآنی کی شرح ارشاداتِ نبوی کی مدد سے کرنے کی بڑی کامیاب کوشش کی گئی ہے اور ہر تفسیری قول کے ساتھ باضابطہ اسناد نقل کی گئی ہیں۔ تفسیر ابنِ کثیر کو فن تفسیر کی "اُمہات کتب" میں شمار کیا جاتا ہے۔

تاریخ کے فن میں علامہ ممدوح کی گراں قدر تالیف "البدایہ والنہایہ فی التاریخ" ہے۔ جو صاحب کشف الظنون کے بقول صحیح اور غلط روایات میں امتیاز کرنے میں اپنی مثال آپ ہے۔ اس تالیف کی چند خصوصیات یہ ہیں :۔

(۱) یہ تالیف تاریخ عالم کا درجہ رکھتی ہے۔ جس میں پہلی قوموں اور انبیائے سابقین کے حالات بڑے اختصار سے قلم بند کیے گئے ہیں لیکن سنین درج کرنے کا کوئی اہتمام نہیں۔ البتہ آنحضورؐ کی ہجرت کے واقعہ کے بعد جملہ واقعات سنین وار بیان کیے گئے ہیں۔ اور سنہ ۷۶۸ھ تک اُمت مسلمہ کے عہد بہ عہد نشو و ارتقاء کے تاریخی وقائع بڑی تحقیق و دیانت سے قلم بند کیے گئے ہیں۔

(۲) گو علامہ موصوف سے پہلے مؤرخین نے اسناد کی جانچ پڑتال اور اخبار کی جمع و تدوین میں بڑی کاوش کی تھی لیکن روایات کو درایت کی کسوٹی پر پرکھنے کی تدبیر نہ کی تھی۔ جس کے باعث بعض غلط

روایات نقل در نقل ہوتی چلی آئیں۔ اور ذہنوں پر چھا گئیں۔ علامہ ابن کثیر نے فن درایت کو تاریخ نویسی کی بنیاد بنایا۔ اور کتاب وسنت اور عقل عام کی کسوٹی پر پرکھا۔ اور اس طرح تاریخی روایات کی تنقیح وتہذیب کے جدید اسلوب کی طرح ڈالی۔ جسے بعد میں علامہ ابن خلدون نے نکتہ کمال تک پہنچایا۔

(۳) اس تالیف میں دیگر بعض عربی تواریخ کی طرح "وفیات" کو شامل کر دیا گیا ہے اور مشاہیر اسلام کے حالات درج کیے گئے ہیں۔ جس مواد سے استفادہ کر کے اس دور کی علمی وتہذیبی تاریخ بآسانی مرتب کی جاسکتی ہے۔

(۴) اہل نظر بخوبی آگاہ ہیں کہ یہ عالمانہ تالیف اہل سنت والجماعت کے نقطہ نظر سے مرتب کی گئی ہے۔ علامہ موصوف شیعہ مؤرخین کی متعدد روایات کا احتساب فرماتے ہیں اور اپنے موقف کی حمایت میں کتاب وسنت کے نصوص سے کام لیتے ہیں۔ لیکن اس کے باوصف وہ اتنے خدا ترس اور متدین ہیں کہ تاریخی حقائق کو چھپانے کی کہیں کوشش نہیں فرماتے۔

علامہ ممدوح کی تالیفات کا سب سے قابل ذکر پہلو یہ ہے کہ انہوں نے مشاجرات صحابہ کے موضوع پر گفتگو کرتے ہوتے بڑی ہوشمندی اور سوجھ بوجھ سے کام لیا ہے اور اس وادی پُرخار میں پھونک پھونک کر قدم رکھا ہے۔ امام موصوف نے یہ اہتمام کیا ہے کہ کسی صحابی رسول مقبولؐ کی ذات والا تبار پر کوئی الزام یا آنچ نہ آنے پائے۔ یہاں تک کہ انہوں نے حضرت امیر معاویہؓ کے نکتہ چینوں کے شکوک وشبہات کو رفع کرنے کی تدبیر کی ہے اس معاملے میں وہ امام طبری سے بھی کئی قدم آگے ہیں، جنہوں نے اس موضوع پر قلم آرائی کرتے ہوتے خاصی احتیاط سے کام لیا تھا۔ لیکن بلا قصد ایسی روایات جمع فرما گئے تھے جس سے بعض صحابہ کبار کی شان پر حرف آتا ہے۔

متذکرہ بالا کمالات اور تالیفات کے سبب علامہ ممدوح کو ارباب علم نے " امام کبیر" اور "مؤرخ شہیر" کے القابات سے نوازا ہے۔

ہم ابن کثیر کے بارے میں اپنی معروضات علامہ ذہبی کے اس قول پر ختم کرتے ہیں کہ ابن کثیر "فقید المثال مفتی، محدث، فقیہ، محقق، مورخ ___ اور مفسر تھے۔"

لِسانُ الدّین بن خطیب

مؤلّف "اخبارِ غرناطہ"

محمد لسان الدین خطیب، حاکمِ غرناطہ سلطان محمد بن یوسف کے معتمدِ خاص اور وزیرِ کبیر تھے۔ وزارت اور سفارت کی ذمہ داریاں، تصنیف و تالیف کی راہ میں حائل تھیں۔ لیکن انہوں نے شمع اور کتاب کو اپنا ہمدم اور رفیق بنا لیا۔ اور راتوں کو جاگ جاگ کر اپنی تالیف "الاحاطہ فی اخبارِ غرناطہ" مرتّب کی۔ ہ بلاشُبہ وزیر موصوف نے یہ کتاب لکھ کر نہ صرف اپنے وطن کو زندہ جاوید بنا دیا۔ اور اس کا حقِ توصیف ادا کر دیا بلکہ اس سرزمین کے فرزندانِ جلیل کو اپنے تذکرے سے حیاتِ جاوداں بخشی ہے۔ اخبارِ غرناطہ میں مشاہیر اسلام اور اُن کے والدین کے ناموں کی حروفِ تہجی کے لحاظ سے ترتیب قائم رکھنے کا التزام کیا گیا ہے۔

مشاہیرِ غرناطہ میں سے ہر ایک کے وطن، مسلک، مذہب، وجہِ شہرت اور تالیفات کے بارے میں ضروری معلومات پیش کی گئی ہیں۔ اور اگر کسی پر کوئی افتاد پڑی تو اس کا مؤثر پیرایۂ بیان میں ذکر کیا گیا ہے۔ اور آخر میں ان کی وفات کے سن و سال کی تصریح کی گئی ہے۔ اگر کوئی بزرگ دوسرے علاقے سے غرناطہ میں آئے تو اُن کے غرناطہ میں وُرُود کے زمانے کا تعیّن بھی کیا گیا ہے اور اگر ان میں سے کوئی غرناطہ سے کہیں باہر تشریف لے جاتے۔ تو اس کی بھی تصریح کر دی گئی ہے اور اُن کے قیام کی مُدت واضح طور پر بیان کی گئی ہے۔

مشاہیر کے سوانح حیات کے بیان کے سلسلے میں سب سے پہلے سلاطینِ غرناطہ کا ذکر ہے اس کے بعد علماء، فضلاء، اور قضاۃ، فقہاء، اور محدثین کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ بعد ازاں مصنفین، مؤلفین، شُعراء اور اُمراء کے سوانحِ حیات قلم بند کیے گئے اور سب سے آخر میں زاہدین، عابدین، صوفیا اور فقراء کے گروہ کا

ہ فاضل موصوف کی کل تالیفات کی تعداد ساٹھ کے لگ بھگ ہے۔

بیان ہے تاکہ ابتدا حکمرانوں سے ہو اور انتہا اُس طبقے پر ہو جو کسی قوم کی رُوحِ رواں ہوتے ہیں"۔
سرزمین غرناطہ کی شخصیات کے بیان سے پہلے تقریباً پچاس صفحات کا مقدمہ ہے جس میں وزیر موصوف نے غرناطہ کے جغرافیائی ماحول تاریخی پس منظر، کے پہلو بہ پہلو، غرناطہ کے شاہی باغات، شاہی عمارات، اور زرخیز اراضیات کا مفصّل تذکرہ پیش کیا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ غرناطہ کے باشندوں کے اخلاق، عادات، انساب، ملبوسات، سب پر سیر حاصل بحث کی ہے اور وہاں کی تہذیب و ثقافت کے آثار کا ایسے حسین پیرائے میں نقشہ کھینچا ہے کہ

؎ کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجا است

وادیٔ غرناطہ کی تہذیب کے بارے میں لسان الدین کے فاضلانہ مقدمے کا لُبِّ لباب یہ ہے کہ غرناطہ کے باشندے اہلِ سُنّت والجماعت کے مسلک اور مالکی فقہ پر عمل پیرا ہیں۔ یہاں کے اُندلسی باشندوں کی رنگت سُرخ و سپید، بال سیاہ اور قد میانہ ہوتے ہیں۔ یہاں کئی نسلیں آباد ہیں۔ مثلاً بربری، اور عربی النسل! مقامی باشندوں کی نسبت مہاجرین (باہر سے آنے والوں) کی تعداد زیادہ ہے۔ مرد و زن کے نفیس و مرصّع ملبوسات کو دیکھ کر یوں گمان ہوتا ہے کہ جیسے لطیف ہوا کے جھونکوں سے چمن میں غنچے چٹکنے لگیں۔ ہر بڑے قریے میں پچاس سے زائد مسجدیں موجود ہیں۔ غرناطہ کی خواتین بڑی نازک اندام و گل فام ہیں۔ ان کے گیسو دراز اور عنبر فشاں ہیں۔ وُہ بڑی سُبک رفتار، خوش گفتار اور نیک اطوار ہیں جن شخصیات کا تذکرہ ابن الخطیب نے مرتّب کیا ہے ان میں چند خواتین کو بھی شامل فہرست کر لیا گیا۔ مثلاً حمدہ بنت زیاد المکتب جو اپنے وقت کی بہترین شاعرہ و کاتبہ تھی۔ یا حفصہ بنت الحاج رکونی جو فصاحت و بلاغت اور حسن و ظرافت میں یگانۂ روزگار تھی۔ یہ روایات اس چیز کی نشاندہی کرتی ہیں کہ اندلس کے مسلمان معاشرے میں عورت کو کتنا بلند مقام حاصل تھا۔ کتاب کی ابتداء میں فاضل مؤلف نے دعویٰ کیا ہے کہ غرناطہ کو اپنے جانبازوں پر فخر ہے کہ جن کے ناگہانی داخلے سے صبح ترساں اور شام لرزاں ہے، غرناطہ ایسے رؤسا کا مسکن ہے جن کے جود و سخا کا یہ عالم ہے کہ گویا ابر بھی بارش برسانے میں ان کی فیاضی کا محتاج ہے۔ غرناطہ میں ایسے متبحر عالم موجود ہیں جن کے سامنے علوم و فنون سجدہ ریز ہیں۔ اور ایسے اولیاء اللہ پائے جاتے ہیں جو خود بظاہر پراگندہ حال و پریشان صورت نظر آتے ہیں لیکن خلقِ خدا کو سکونِ خاطر اور طمانیتِ دل کی نعمتوں سے بہرہ مند کرتے ہیں۔ غرناطہ میں ایسے ایسے

فُصحاء اور بُلغاء آباد ہیں جو دریائے فصاحت و بلاغت میں گوہر ہائے آبدار کی تلاش کے لیے غوطہ زن رہتے ہیں۔ اس عالمانہ و ادیبانہ تالیف کو پڑھنے کے بعد انسان مجبور ہو جاتا ہے کہ وہ فاضل مؤلف کے ان تمام دعاوی کی تصدیق کرے۔

۵ آفتاب آمد دلیل آفتاب!

اخبارِ غرناطہ کی دوسری جلد امیر محمد بن یوسف (بن اسماعیل) کے نام نامی سے شروع ہوتی ہے۔ جن کا سلسلہ نسب صحابیٔ رسولؐ حضرت سعد بن عبادہ سے جا ملتا ہے۔ لسان الدین خطیب پہلے اندلس کے اس امیر (سلطان) کے دربار میں کاتب (معتمد) ہے اور پھر ترقی کرتے کرتے وزارتِ اعلیٰ کے منصب تک جا پہنچے۔ لسان الدین خطیب رقم طراز ہیں "میرے ساتھ ان کی محبّت بڑھتی چلی گئی اور مجھے سلطان کی خدمت میں اتنا تقرّب حاصل ہوا کہ ان کے اور میرے درمیان جو راز کی باتیں ہوتی تھیں ان کا جاننے والا میرے سوا کوئی نہ تھا" بادشاہ اور وزیر کے مابین راز کی باتیں کیا ہوتی ہوں گی؟ اس کا اندازہ بھی "اخبارِ غرناطہ" سے کیا جا سکتا ہے۔ شاہ سلطان محمد بن یوسف کے مکتوب میں قوم کے نام یہ پیغام درج ہے۔ "عیسائیوں کے متحارب فرقے متحد و منظّم ہو کر اندلس سے اسلام کے آثار و علائم کو مٹانے کے دَر پے ہیں۔ پس عوام و خواص کو چاہیئے کہ دشمن کے مقابلے کے لیے بنیانِ مرصوص بن جائیں۔ شہوات کو ترک کر کے خدا سے رشتہ جوڑ لیں اور جہاد فی سبیل اللہ کے لیے تیار ہو جائیں۔" ادھر لسان الدین خطیب لکھتے ہیں کہ ہم نے رومی اور عیسائی بادشاہوں کے حالات محض اس لیے نہیں بیان کیے۔ کہ ان میں تاریخی ندرت ہے۔ بلکہ مقصود یہ ہے کہ مسلمان دشمنوں کی ریشہ دوانیوں اور چالبازیوں سے آگاہ ہو کر ان کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو جائیں۔

معلوم ہوا کہ سلطانِ غرناطہ اور اس کے مشیرِ باتدبیر دونوں غرناطہ کو اسلام کا ناقابلِ تسخیر حصار بنانا چاہتے تھے اور اندلس کے دوسرے بڑے بڑے شہروں پر نصرانیوں کے تسلّط کی وجہ سے جو اُفتاد پڑ چکی تھی۔ اس سے غرناطہ کو بچانا چاہتے تھے۔ لسان الدین خطیب محض ایک مورّخ ہی نہیں بلکہ ایک مصلحِ اخلاق اور قوم کے سچے بہی خواہ بھی ہیں۔ اسی لیے ان کی تالیف ہوشمندی اور دردمندی کے جذبے سے مملو ہے اور اخبارِ غرناطہ کی تالیف سے مقصود بھی یہی ہے کہ لوگ مشاہیرِ غرناطہ کے اوصاف و کارناموں سے مستفید ہو کر اپنے اندر وہی خوبیاں اور کمالات پیدا کریں جو ان کا طرّۂ امتیاز

ہیں۔اس اعتبار سے "اخبار غرناطہ" محض اعاظم رجال کے علمی کارناموں کا تذکرہ ہی نہیں بلکہ ایک دانشمند وزیر اور ایک ہوشمند مؤرّخ کا اپنے اہلِ وطن کے نام حیات آفرین پیام ہے۔

آخر میں یہ بیان کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ لسان الدین خطیب کے ہاتھوں غرناطہ میں خیر و برکت کا دَور دَورہ ہوا۔ دفاعی انتظامات میں مستعدی دکھائی گئی۔ عوام میں جوشِ جہاد پیدا ہوا۔ اختلافات و نزاعات ختم ہوئے، اتحاد و اتفاق کے لیے عملی تدبیریں کی گئیں اور نصرانی ملُوک و سلاطین کے جارحانہ حملوں کا صدی ڈیڑھ صدی تک، اہلِ غرناطہ نے پامردی سے مقابلہ کیا۔ اور اندلس میں تقریباً ڈیڑھ صدی تک غرناطہ اسلام کا آخری قلعہ ثابت ہوا۔ اور لسان الدین بن خطیب کی تالیف "اخبار غرناطہ" اُنہیں اتحاد کی دعوت اور جہاد کا عملی درس دیتی رہی۔

علمی مرتبہ

لسان الدین خطیب کی مؤرخانہ عظمت کا اندازہ اس امر سے کیا جاسکتا ہے کہ امام ابن حجر عسقلانی نے الدُّرر الکامنہ میں اُنہیں بڑے زوردار الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ اسی طرح احمد حسن زیات تاریخ ادبِ عربی میں لکھتے ہیں " اندلس میں علم و ادب کی امامت اسی طرح لسان الدین خطیب پر ختم ہوگئی جس طرح افریقہ میں علم و ادب کی سیادت ان کے ہم عصر ابن خلدون پر ختم ہوگئی۔ اُن کا فنِ تاریخ میں نہایت بلند مقام ہے۔

ابنِ خلدونؒ

(المقدّمہ)

عمرانی وسیاسی افکار :-

ابوزید عبدالرحمان بن محمد المعروف علامہ ابن خلدون نہ صرف اپنے دور کے متبحر عالم، اور ممتاز مورّخ تھے۔ بلکہ فلسفۂ تاریخ کے باوا آدم، علم عمرانیات کے بانی مبانی اور ایک مایہ ناز سیاسی مفکر بھی تھے۔

اس نابغہ روزگار محقق نے تقریباً پچھتر عالمانہ کتابیں سپردِ قلم کیں تھیں۔ جن کی فہرست لسان الدین ابنِ خطیب نے اپنی تالیف "الاحاطہ فی اخبارِ غرناطہ" میں نقل کی ہے۔ لیکن ہم تک ان کی واحد تصنیف "العبر ودیوان المبتداء والخبر" سات جلدوں میں پہنچی ہے۔ اس کی پہلی جلد جو "مقدّمۂ ابنِ خلدونؒ" کے نام سے مشہور ہے۔ بقول پروفیسر رشید احمد "سیاسی افکار کا بہترین ذخیرہ ہے"۔ لہ

ابنِ خلدونؒ کے سیاسی و عمرانی افکار کے مطالعہ سے پہلے ہمیں یہ جاننا ضروری ہے کہ علامہ موصوف حاجب (سیکرٹری) اور قاضی کے عہدوں پر فائز رہے تھے۔ سلطان ابوالسحاق والئ تیونس، سلطان ابن الاحمر والئ اُندلس، سلطان برقوق والئ مصر، ان سب سلاطینِ عصر کے درباروں میں ممتاز عہدوں پر سرفراز رہ چکے تھے۔ اور امیر تیمور بھی علاّمہ موصوف کو اپنے ہمراہ لے جانا چاہتا تھا۔ پس ابن خلدونؒ بحرِ سیاست کے عملی شناور تھے یہی وجہ ہے کہ اُن کے سیاسی افکار میں فلسفیوں کی تصوّریت کے پہلو بہ پہلو عملی سیاستدانوں کی حقیقت پسندی کا پرشکوہ امتزاج پایا جاتا ہے۔

اجتماع کیونکر ممکن ہُوا؟ اور قانون یا ایک بااختیار حکومت کی ضرورت کیسے محسوس ہوئی۔ ان میں سے پہلے مسئلے کے بارے میں وہ کہتے ہیں کہ انسان فطرتاً مدنی الطبع ہے۔ نیز اپنی حاجات کو پورا کرنے اور زندگی کو محفوظ رکھنے میں دوسروں کی امداد کا محتاج ہے۔ اس لیے اجتماع وجود میں آگیا۔

لہ مسلمانوں کے سیاسی افکار۔ صفحہ

دوسرے مبحث کا جواب دیتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ جب اجتماع قائم ہوتا ہے تو افراد کے مفادات و مصالح میں تصادم شروع ہو جاتا ہے۔ یہیں سے قانون اور ایسی منظم حکومت کی ضرورت محسوس ہوتی ہے جو تشدّد آمیز متصادم خواہشات کا قلع قمع کر سکے اور ایک فرد یا طبقے کو دوسرے (افراد یا طبقوں پر) ظلم کرنے سے روک سکے۔ پس امن و سلامتی کو برقرار رکھنے کی خواہش ہی تشکیلِ ریاست و قیامِ حکومت کا سبب بن جاتی ہے۔ الغرض ابنِ خلدون کے نزدیک اجتماع تو فطری جذبۂ مدنیت کا مظہر ہے۔ لیکن اس کا سیاسی ہیئت اختیار کر لینا انسانی غور و فکر کا حاصل و ثمرہ ہے۔ جس کا مقصد امن و سلامتی کو بحال رکھنا ہے۔ کیا یہ حیرت انگیز بات نہیں کہ چار صدیوں بعد ہمیں مونتیسکو کی تحریروں میں ابن خلدون کے افکار کی صدائے بازگشت سنائی دیتی ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ فرانسیسی محقق "ژین بودین" سے دو صدی پہلے ابن خلدون نے پوری وضاحت سے بیان کیا کہ اقلیم اور جغرافیاتی ماحول اور مذہب، یہ تینوں عوامل انسانی تمدّن پر فیصلہ کن اثر ڈالتے ہیں۔ سیاسیات کے طبعی پس منظر (PHYSICAL BACKGROUND) کے اسی نظریہ کو انگلستان کے فلسفی مونتیسکو نے صدیوں بعد پیش کیا۔

علامہ ابن خلدون سیاست و حکومت کی دو اصولی اقسام بیان فرماتے ہیں۔ اوّل دنیوی یا عقلی سیاست دوم دینی حکومت یا مذہبی ریاست۔ علامہ موصوف لکھتے ہیں "حکومت کی قانون سازی کا کام اگر عقلِ انسانی انجام دیتی ہے تو حکومت عقلی سیاست کے ماتحت قائم ہوتی ہے اور اگر اللہ تعالیٰ کی جانب سے کسی ایسے شخص کی معرفت فرضِ نیابت کی ادائیگی کی شکل میں عاید ہوتی ہے تو حکومت کے لیے دینی سیاست کی داغ بیل پڑ جاتی ہے جو حیاتِ دنیا اور ثباتِ آخرت، دونوں میں مفید و کارگر وسیلہ ثابت ہوتی ہے۔

عقلی و دینی نظام ہائے حکومت کے اغراض و مقاصد کے اصولی فرق کو علامہ ممدوح یوں واضح کرتے ہیں کہ "سیاسی و عقلی حکومت وہ ہے جو سوسائٹی کو عقلی مطمح نظر کے ماتحت دنیاوی حفاظت اور دفاع کے لیے تیار کرے اور دینی حکومت یا خلافت وہ ہے جو آخرت کی فلاح کو اوّلیت کا درجہ دے۔ اور دنیا کے امور کو مصالح عامّہ کے لیے ثانوی حیثیت بخشے۔

خلیفہ کے اوصاف پر ابن خلدون نے بڑی سیر حاصل بحث کی ہے۔ اس کے نزدیک خلیفہ میں علم [1]، عدالت [2]، سیاسی معاملات میں بصیرت [3] اور سالم الاعضا ہونا [4]، ان چاروں صفات کا خلیفہ میں

پایا جانا ضروری ہے۔ یہاں تک کہ اُسے ایک ایسے بے زنگ آئینے کی مانند ہونا چاہیئے۔ جس میں انسان کی فاضل ترین رُوح کا عکس جلوہ گر ہو۔

ابن خلدون ہمیں بتاتے ہیں کہ کیونکر بتدریج اسلامی خلافت کی جگہ سیاسی ملوکیت نے لے لی؟ ۔۔۔۔ گو معیاری نظامِ حکومت خلافتِ راشدہ کو ہی قرار دیتے ہیں۔ لیکن وحدتِ اسلامی کو پارہ پارہ ہونے سے بچانے کے لیے ملُوکیّت کی تھوڑی بہت حمایت بھی کرتے ہیں۔ کہ یہ ملوکانہ طرزِ حکومت اُن کے نزدیک اس لیے ناقص ہے کہ اس کی بُنیاد دین یا روحانیت کی بجائے قبائلی یا ملکی عصبیّت پر ہوتی ہے۔ تاریخ اسلام میں ابن خلدون ہی پہلے مفکر ہیں جنہوں نے بیک زمانہ دو یا دو سے زائد خُلفاء کے وجود کو جائز قرار دیا۔ حالانکہ اُن کے پیش رو مفکرّین سیاست پوری مملکتِ اسلامیہ کو ایک ہی خلیفہ کے زیرِ فرمان دیکھنا چاہتے تھے۔ ابن خلدون نے خلیفہ اور رعایا کے تعلّقات پر بھی مفصّل بحث کی ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ مملکت کی فلاح و بہبود کا تمام تر انحصار رعایا اور راعی کے باہمی تعلّقات کی استواری و خوشگواری پر ہے۔

سلطنتوں کے زوال کے حقیقی اسباب کیا ہوتے ہیں؟ اور وہ عام قواعد کیا ہیں جن سے ہم سلطنتوں کے زوال کی توجیہہ کر سکتے ہیں؟ اس نازک موضوع پر علامہ ابن خلدون کے مجتہدانہ افکار پیش کیے ہیں جن کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں۔ البتہ اس بات کی طرف سرسری اشارہ کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس یگانۂ روزگار مورّخ نے جابجا سلطنت کے ادارے کو فرد کی زندگی سے تشبیہہ دی ہے۔ اُن کے نزدیک سلطنت بھی انسان کی طرح پیدا ہو کر عالمِ شباب تک پہنچ کر پھر فنا و نیستی کے گھاٹ اتر جاتی ہے۔

ابنِ خلّدون کا طُرّۂ امتیاز، اس کا یہ نقطۂ نظر بھی ہے کہ سیاسیات میں معاشی مسائل کو بنیادی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ اور سیاست اور اقتصادیات کا چولی دامن کا رشتہ ہے۔ چنانچہ وُہ تجارت و زراعت، صنعت و حرفت، نظریۂ قیمت ، نظریۂ طلب و رسد، درآمد، برآمد، ذخیرہ اندوزی کے بارے میں بڑی عُمدگی سے بحث کرتے ہوئے، سیاسی زندگی پر معاشی محرکات کے اثرات کی نشاندہی کرتے ہیں۔ ابن خُلدون کے یہی عمرانی و سیاسی افکار ہیں جن کی عصرِ جدید میں بھرپور توصیف احمد حسن زیّات، سید سلیمان ندوی اور ڈاکٹر طٰہٰ حسین (مصری) نے کی ہے۔ اور جن کے افکار کی نُدرت و

جدّت کو مغربی مفکرین بوده سلان ، فلنٹ ہیکس میرلف اور چارلس عیسوی جیسے مغربی محققین نے بھی سراہا ہے۔

علمی زندگی کے ادوارِ ثلاثہ :۔

ابنِ خلدون کی سیاسی و علمی زندگی ۔۔۔ تین ادوار پر مشتمل ہے ۔جن پر طائرانہ نظر ڈالنے سے مقدّمہ ابن خلدون کا زمانہ تالیف بآسانی دریافت کیا جاسکتا ہے۔

اوّل ۔ علامہ موصوف کی ۲۱ برس کی عمر سے لے کر اکتالیس برس کی عمر کا یہ عہد سیاسی تحریکوں میں غیر معمولی انہماک کا دَور ہے۔آپ نے فاس ، اُندلس ، بجایہ اور بکیرہ کے سلاطین و اُمراء کے درباروں میں شاہی کاتب یا شاہی حاجب کی حیثیت سے کام کرنے کا اعزاز پایا۔اور کبھی دشمنوں کی سازشوں اور حاسدوں کی ریشہ دوانیوں کے باعث زونقِ زنداں رہے اور کبھی ستارۂ تقدیر ایسا گردش میں آیا کہ ایک علاقے سے دوسرے علاقے کی طرف ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے۔گاہے منصب و جاہ کی سرفرازیوں نے اُن کے قدم چومے اور کبھی نکبت و ادبار کے خارزاروں میں انہیں آبلہ پائی کا لُطف اُٹھانا پڑا۔

دوم ۔ علامہ ممدوح کو بیالیس برس سے چھیالیس برس کی عمر تک اُندلس کے قلعہ ابنِ سلامہ میں عزلت گزینی اور گوشہ نشینی اختیار کرنی پڑی اور مقدمہ جیسی شہرۂ آفاق تالیف اُنہی ایام فرصت کی مرہونِ منّت ہے۔یہ کتاب آپ کی سابقہ مضطرب سیاسی زندگی کے وسیع تجربات کا حاصل و جوہر ہے۔ اور آئندہ تصنیف و تالیف کی زندگی کا ثمرہ ہے۔یہ تالیف آپ کی پہلی سیاسی اور بعد کی علمی زندگی کے مابین بمنزلۂ خطِ امتیاز ہے۔

سوم ۔ اس زمانے میں ابتدائی چار برس علامہ موصوف نے شاہ تونس کی سرپرستی میں تاریخ اسلام کی سات جلدیں مکمل کرنے میں صرف کیئے۔اس تاریخ کی تکمیل پر علامہ موصوف نے ایک قلمی نسخہ شاہ تونس کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت پائی۔ بعد کے چوبیس برس اُنہوں نے مصر کی سب سے بڑی درس گاہ "جامعہ ازہر" میں درس و تدریس کے فرائض سرانجام دیئے۔جہاں عُلماء اُن سے فیض یاب ہوتے۔ اور اُن کے تبحرِ علمی پر ورطۂ حیرت میں ڈوب جاتے۔اسی درس و تدریس کے زمانے میں ، آپ نے مقدمۂ ابنِ خلدون ، اور تاریخ اسلام کی مجلدات پر نظرِ ثانی فرمائی۔ خصوصًا مقدمہ کی

ابواب وفصول کی ترمیم واصلاح فرمائی۔

؎ سو بار جب عقیق کٹا تب نگیں ہُوا

بمطابق ۸۰۸ھ اسلام کا یہ بطلِ جلیل وفات پا گیا لیکن اُس کے مقدمۂ تاریخ نے اُسے حیاتِ جاوداں عطا کر دی۔ قاہرہ کی سرزمین مفتخر ہے کہ یہ نابغہ جلیل اس کی آغوش میں (مقبرہ صوفیہ میں) محوِ استراحت ہے۔

تاریخ ابنِ خلدون

(۲)

ابن خلدون کی تاریخ کا پورا نام کتاب العبر و دیوان المبتدا والخبر فی ایام العرب والعجم والبربر ومَن عاصرہم من ذوی السلطان الاکبر ہے۔

اگرچہ ابن خلدون کی تالیف کی سات جلدیں ہیں لیکن چونکہ علامہ موصوف نے خود ہی اپنی مجلدات کو تین حصوں (کتاب اوّل، کتاب ثانی، کتاب ثالث) میں بانٹ دیا ہے۔ اس لیے ہم سات جلدوں پر الگ الگ گفتگو کرنے کی بجائے اس گراں قدر تالیف کے تین حصوں پر بحث کریں گے۔ تاکہ قارئین کو فہمِ مضامین میں کوئی دشواری نہ پیش آئے۔

کتاب اوّل :۔ (المعروف بہ المقدمۃ ابن خلدون)

اس حصے میں عمرانیات (انسانی معاشرے کے متنوع گوشوں یعنی اجتماعی تمدنی جغرافی اقتصادی علمی، ادبی اور مذہبی پہلوؤں پر بڑی بصیرت افروز اور علم آموز بحث کی گئی ہے اور انہوں نے فلسفیانہ اور پُرحکمت مضامین پیش کر کے بانی فلسفہ تاریخ کی حیثیت میں اپنوں بے گانوں سے بے پناہ خراجِ تحسین حاصل کیا ہے (گذشتہ باب میں اس پر ہم مفصل بحث کر چکے ہیں)

کتاب ثانی میں قبائل عرب کے اخبار و روایات کو جمع کیا گیا ہے۔ اور عربوں نے زمانہ قدیم سے لے کر مصنف کے عہد تک جو سلطنتیں قائم کیں ان کا بیان ہے۔ اس کے علاوہ دنیا کی دوسری مہذب و متمدن اقوام مثلاً ایرانیوں، یونانیوں، رومیوں، ترکوں اور بنی اسرائیل کی تاریخ قلم بند کی گئی ہے۔

کتاب ثالث :۔ اقوامِ بَربَر کی تاریخ کے لیے مخصوص ہے۔ اور اس حصے میں ان تمام خاندانوں اور حکومتوں کی تاریخ مندرج ہے جو شمالی افریقہ میں قائم ہوئیں۔ چونکہ مصنف نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ ان ملکوں اور قوموں کے درمیان بسر کیا تھا اس لیے انہوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ ذاتی تحقیق اور واقفیت کی بنا پر لکھا ہے۔ اسی لیے شمالی افریقہ کی تاریخ میں ان کا فراہم کردہ مواد مستند ترین مآخذ کا درجہ رکھتا ہے۔

تاریخ ابن خلدون کی خصوصیات :-

تاریخ اسلام کے موضوع پر جتنی بھی تصانیف لکھی گئی ہیں۔ اُن میں علامہ عبدالرحمان ابن خلدون کی تاریخ ایک منفرد مقام کی حامل ہے۔ اُس کی برتری اور فضیلت کے چند پہلو یہ ہیں۔

اوّل :- محمد ابن جریر طبری کی تاریخ الرسل والملوک سنہ ۳۰۲ھ تک کے واقعات پیش کرتی ہے۔ مسعودی کی تالیف مروج الذہب میں سنہ ۳۳۶ھ تک کے حالات کا بیان ہے۔ ابن مسکویہ کی محققانہ تالیف تجارب الامم سنہ ۳۶۹ھ تک کے تاریخی احوال پر حاوی ہے۔ ابوالفدا نے اخبار البشر میں سنہ ۷۲۱ھ تک اسلامی تاریخ کے واقعات سپردِ قلم کیے ہیں۔ لیکن ابن خلدون کی تصنیف اسلام کی پہلی آٹھ صدیوں کی تاریخ پر محیط ہے۔ اور اسی سبب سے دوسری تمام تصنیفات پر فوقیت رکھتی ہے۔

دوئم :- ابن خلدون نے ایک طرف ترتیب زمانی کو ملحوظ رکھا ہے تو دوسری طرف تاریخی واقعات کو ملکوں اور حکمرانوں کے اعتبار سے ترتیب دیا ہے جس سے نہ صرف تاریخی واقعات کا تسلسل باقی رہتا ہے بلکہ تاریخی حقائق کو سمجھنے میں قاری کو بڑی آسانی رہتی ہے۔

سوئم :- واقعات اور حوادث کے اسباب و علل کا باہمی ربط متعیّن کرنے میں ابن خلدون نے جس غیر معمولی مورّخانہ بصیرت اور مفکرانہ ژرف نگہی کا ثبوت دیا ہے۔ اس کی نظیر نہ متقدمین مورخین میں ملتی ہے اور نہ متاخرین میں! احمد حسن زیّات کے الفاظ میں " انہوں نے تاریخ کے موضوع پر گہری نظر ڈال کر اس کے مباحث متعین کیے اور حوادث کی علتیں بتائیں "۔

چہارم :- ابن خلدون نے مقدمہ میں تاریخی تحقیق و تنقید کے لیے جو اصول قائم کیے تھے۔ اور قدیم مؤرخین کی فکری لغزشوں کی نشاندہی کی تھی۔ اپنی تاریخ میں وہ حتی الامکان اُن تسامحات سے محفوظ رہے ہیں اور روایت کے پہلو بہ پہلو درایت سے کام لینے میں انہوں نے غیر معمولی کاوش کا ثبوت دیا ہے۔

پنجم : ابنِ خلدون نے معاصر مؤرخین کی مسجّع و مقفّیٰ عبارت لکھنے کی روش سے آزاد ہو کر سلیس اور شگفتہ اسلوب نگارش کو اختیار کیا۔ وہ یہ نظریہ رکھتے تھے کہ مسجع اسلوبِ نگارش میں، بخلاف آزاد نثر کے، حقائق و معانی دونوں پوشیدہ رہتے ہیں۔

ششم :- اس تالیف کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ ایک حکومت کے اختتام کے بعد جب دوسری حکومت کا بیان نئی فصل میں کیا جاتا ہے تو اس نئی فصل کے شروع میں فلسفیانہ تمہید باندھی جاتی ہے جو یقیناً

ہر نئے باب کے فلسفیانہ مقدمے کا درجہ رکھتی ہے۔

ھفتم۔ ابن خلدون نے سیاسیات سے کنارہ کش ہو کر کتاب اوّل قلعہ بنی سلامہ میں اپنے قیام کے دوران لکھی تھی۔ کتاب ثانی وثالث (تاریخ عالم) لکھنے کی ابتداء بھی انہوں نے وہیں فرمادی تھی۔ لیکن اُسے پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے اُنہیں کتب خانوں کی طرف رجوع کرنا پڑا۔ چنانچہ آپ تونس تشریف لائے اور وہاں کتاب ثانی وثالث کے بارے میں فراہم کردہ مواد کو آخری صورت دی۔ ڈاکٹر عنایت اللہ صاحب کی تصریح کے مطابق علامہ موصوف نے اپنی تاریخ میں ملوکِ عجم اور ترکی اقوام کے حالات اس وقت شامل کیے جب وہ مصر میں (جو بغداد کی تباہی کے بعد دنیائے اسلام کا علمی مرکز بن چکا تھا) تشریف لائے کیونکہ وہاں انہیں ایسی کتابوں سے استفادۂ علمی کا موقعہ ملا جو بلادِ مغرب کے کتب خانوں میں دستیاب نہ ہوسکتی تھیں۔

آخر میں یہ کہنا مناسب ہوگا کہ ابن خلدون کا "المقدمہ" اور حصّہ تاریخ دونوں علم وادب کی تاریخ میں بے مثال ہیں۔ مقدمۂ تاریخ آفتاب ہے تو تاریخی حصص مہ ونجوم ہیں جن سے اُفقِ ہستی مطلع انوار ہے۔

ابن خلدون کا علمی مقام :-

ابنِ خلدون کے علمی مرتبے کے بارے میں ہم یہاں مسلم اور غیر مسلم محققین کی آراء الگ الگ نقل کرتے ہیں۔

لسان الدین ابن خطیب ابن خلدون کو شاندار الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ وہ علومِ عقلیہ ونقلیہ کا باکمال محقق تھا۔

استاذ احمد حسن زیات لکھتے ہیں کہ " ابن خلدون پہلا شخص ہے جس نے فلسفۂ تاریخ کا استنباط کیا۔

ڈاکٹر طہٰ حسین کا خیال ہے کہ ابنِ خلدون کا مقدمۂ تاریخ یہ حق رکھتا ہے کہ دورِ جدید کے فلاسفہ اور علمائے اجتماعیات اس سے استفادہ کریں۔

سید سلیمان ندوی فرماتے ہیں " مقدمہ ابنِ خلدون درحقیقت اُس زمانہ تصنیف تک کے انسانی علوم اور خیالات پر سب سے پہلا تبصرہ اور تاریخ کے واقعات کو سائنس بنانے کی سب سے پہلی کوشش اور اقتصادیات (اکانومی) اور اجتماعیات (سوشیالوجی) ہر ایک فن کی حیثیت سے سب سے پہلی نگاہ ہے۔"

ڈاکٹر عنایت اللہ لکھتے ہیں۔ "بحیثیت ایک فلسفی مورّخ کے کسی عہد یا ملک میں ان سے پہلے ان کا مثیل پیدا نہ ہوا تھا۔"

موسیو دہ سلان لکھتے ہیں۔ "علمی دنیا میں ابن خلدون ہی پہلا شخص ہے جس کے دِل میں پوری انسانیّت کی تاریخ لکھنے کا ایک فلسفیانہ تصوّر پیدا ہُوا۔ اس لحاظ سے وہی فلسفۂ تاریخ کے بانی مبانی ہیں"

فلنٹ لکھتا ہے۔ "فلسفہ تاریخ میں افلاطوں، ارسطو اور اگسٹائن اس کے ہم مرتبہ نہ تھے چہ جائیکہ کسی دوسرے مؤرخ کا نام ابنِ خلدون کے ساتھ لیا جائے۔"

میکس میرہاف کا خیال ہے کہ "ابن خلدون تاریخ کے سب سے عظیم فلسفی اور اپنی صدی کے متبحر عالم ہیں۔"

چارلس عیسوی ابن خلدون کو علوم عمرانی کی تاریخ میں ارسطو اور میکاویلی کے درمیانی دور کی سب سے بڑی شخصیّت قرار دیتے ہیں۔"

فلپ متی کی رائے میں ابن خلدون نہ صرف عالم اسلامی کے سب سے بڑے فلسفی مورّخ ہیں بلکہ تمام تاریخ انسانی کے فاضل ترین فلسفی مورّخین میں سے ایک ہیں۔

المقریزی

نویں صدی ہجری میں مصر اور شام کے ملکوں میں بالخصوص بہت سے جلیل القدر اور عظیم المرتبت مؤرخ پیدا ہوئے۔ ان میں المقریزی سب سے نمایاں ہیں جن کی تاریخی تالیفات نہ صرف بکثرت ملتی ہیں۔ بلکہ فنی اعتبار سے بھی ان کا پایہ بہت بلند ہے۔ ان میں سے بعض تالیفات زیورِ طبع سے آراستہ ہوتی ہیں اور بعض ابھی منظرِ عام پر نہیں آسکیں۔ لیکن یہ سب کی سب کتابیں مباحث کے تنوع، معلومات کی وسعت اور عنوانات کی ندرت کے لحاظ سے عدیم النظیر ہیں۔

احمد بن علی تقی الدین المقریزی ۷۶۶ھ میں قاہرہ میں پیدا ہوئے۔ جہاں اپنے دور کے اکابر علماء سے استفادہ علمی کیا۔ اور مروّجہ علوم وفنون میں کامل دستگاہ بہم پہنچائی۔ بالخصوص فنِ تاریخ میں علامہ موصوف اختصاصی قابلیت رکھتے تھے۔ شروع میں وہ مملکت مصر کے مختلف اہم عہدوں پر فائز المرام رہے۔ لیکن بعد میں انہوں نے خود کو تصنیف وتالیف کے لیے وقف کر دیا۔ اور تاریخ کا وسیع میدان ہی اُن کی فکر ونظر کی کاوشوں کا جولان گاہ بنا۔

احمد بن علی المقریزی کی سب سے اہم تاریخی تالیف "المواعظ والاعتبار بذکر الخطط والآثار" ہے۔ اس تالیف میں علامہ موصوف فنِ تاریخ کے فضائل بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "فی الجملہ علوم کی دو قسمیں ہیں۔ علومِ عقلی، علومِ نقلی، انسان کو چاہیے کہ جب دونوں قسم کے علوم اچھی طرح سیکھ لے تو تمام تر تاریخ کے مطالعے میں لگ جائے۔ اور اس کی عبرتوں پر غور وتدبر کرے۔ اللہ تعالیٰ جس کے دل کے دروازے کھول دیتا ہے اور آنکھوں کے پردے ہٹا دیتا ہے تو اس کو غور وفکر کے نتیجے میں یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ دُوسرے انسان جنہیں اپنی دولت اور فوجی طاقت پر بڑا ناز تھا۔ بالآخر کس طرح ہلاکت اور بربادی سے دوچار ہوئے؟ اس طرح اس دنیا سے مستغنی ہونے اور آخرت پر دھیان دینے کی توفیق نصیب ہوتی ہے۔

اس کے بعد وہ لکھتے ہیں "کتنی بُری بات ہے کہ ایک شخص عالم کہلائے اور سوجھ بوجھ کا دعویٰ کرے

اور پھر جب اس سے اللہ تعالیٰ کے ان رسولوں کی بابت پوچھا جائے جن پر ایمان لانے کا حکم ہے تو وہ جواب میں صرف ناموں کی فہرست گِنا دے اور ان ہستیوں کی بابت کچھ نہ بتا سکے جو اُن عالی قدر ہستیوں کا مسکن تھیں۔ اِسی طرح یہ کتنی نامناسب بات ہے کہ کوئی شخص درس و تدریس اور فتویٰ نویسی کی طرف پیش قدمی کرے اور لوگوں کے جھگڑے چکائے اور شرعی فیصلے دے لیکن یہ نہ جانے کہ محمد مصطفیٰؐ کے احوال کیا تھے اور آپ کی پاکیزہ سیرت، بلند مرتبہ، اور ذاتی و عرفی خوبیاں کیا کیا تھیں؟ یہ باتیں تو وُہ ہیں کہ ہر صاحبِ ایمان کے لیے ان کا جاننا ضروری ہے اور ہر صاحبِ علم کے لیے اُن سے پوری پوری واقفیت رکھنا لابدی امر ہے۔

سیرت و تاریخ کے علوم و فوائد پر المقریزی نے جو کچھ لکھ دیا ہے اُس پر کیا اضافہ کیا جا سکتا ہے؟ الخطط والآثار میں علّامہ مقریزی نے مصر کے تقریباً ہر تاریخی دَور پر ایک جامع باب قائم کیا ہے اور مصر کے متفرق تاریخی واقعات، شہروں کے بسنے یا اُجڑنے کے حالات اور آثار قدیمہ کے عجائبات کو اس عمدگی سے قلم بند کیا ہے کہ یہ تالیف مصر کی دائرۃ المعارف (انسائیکلو پیڈیا) بن گئی ہے۔

اس کے علاوہ علّامہ ممدوح نے مشاہیرِ مصر کے بارے میں "تاریخ سلوک" کے نام سے ایک گراں قدر تالیف قلم بند فرمائی۔ جس میں ۸۴۴ھ تک کے اُن تمام علماء کا تذکرہ ہے جو سرزمین مصر سے اُٹھے اور علم و فضل کے نجوم بن کر چمکے۔ یا باہر سے آکر اس گہوارۂ علم و دانش میں قیام پذیر ہوئے اور اِس نایاب تالیف کے مطالعہ سے ایچ آر گِب جیسا فاضل مستشرق ورطۂ حیرت میں ڈوب گیا اور یہ کہنے پر مجبور ہوا کہ "اس کتاب کی ترتیب و تدوین کچھ اتنے بڑے پیمانے پر کی گئی ہے کہ ہمیں تعجب ہوتا ہے کہ کیونکر ایک فردِ واحد اس کے لیے سرمایۂ علم (موادِ علمی) جمع کرنے کی ہمت کر سکا۔

اس کے علاوہ علّامہ موصوف کی تین کتابیں ایسی ہیں جنہیں اگر یکے بعد دیگرے مِلا کر پڑھا جائے تو ابتدائے آفرینش سے عباسی خلافت کے اختتام تک تمام دنیا کی تاریخ نظروں کے سامنے آجاتی ہے۔ "الخبر عن البشر"[1] تخلیقِ آدم سے شروع ہوتی ہے اور عربوں کے ایامِ جاہلی تک پہنچتی ہے۔ "امتاع الاسماع"[2] سیرتِ نبوی پر حاوی ہے۔ اور الدرر المضیئۃ[3] (فی تاریخ دولۃ الاسلامیہ) حضرت عثمانؓ کی شہادت سے لے کر خلافتِ عباسیہ کے تاریخی حالات پر محیط ہے۔

المقریزی کی بعض دوسری تاریخی تصانیف بعد کے ادوار کے بارے میں بھرپور روشنی ڈالتی ہیں۔

مثلاً فاطمی دور پر اُن کی تالیف "الاعتبار" قابلِ ذکر ہے۔ مزید برآں ایوبی خاندان اور مملوک خانوادے کے بارے میں اُن کی عالمانہ تالیفات محفوظ ہیں۔ گرچہ تاہنوز وہ غیر مطبوعہ ہیں۔

علمی مرتبہ :۔

مارگولیتھ نے اپنے خطبات عربک ہسٹورین میں المقریزی کی تالیف "الخطط والآثار" کے بارے میں یہ رائے ظاہر کی ہے کہ عرب مؤرخین نے مملکتِ اسلامیہ کے دارالخلافوں اور علمی مرکزوں کے بارے میں جتنی تالیفات قلم بند کی ہیں، اُن میں یہ تالیف تحقیق اور کاوش کے لحاظ سے بہتر ہے" اور ہمارے استاذ محترم ڈاکٹر عنایت اللہ صاحب المقریزی کی تمام تاریخی تالیفات کو "حسن ترتیب اور وسعتِ معلومات" کا غیر فانی شاہکار قرار دیتے ہیں۔

ابنِ حجر عسقلانی

آٹھویں اور نویں صدی ہجری میں مصر و شام کے ملکوں میں کئی جیّد علماء اور جلیل القدر مورّخ پیدا ہوتے جو بیک وقت محدّث بھی تھے اور مورّخ بھی۔ ان میں سب سے زیادہ شہرت کے مالک، احمد بن علی حافظ ابنِ حجر عسقلانی ہیں جو جامع الکمالات عالم و مصنّف تھے۔ آپ ۱۳ شعبان ۷۷۳ھ میں مصر میں بمقامِ قاہرہ پیدا ہوتے۔ اوائل عُمر ہی میں والدین کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ تاہم اُن کے سرپرست ذکی الدین نے اُن کی بڑی اچھی تربیّت کی اور نو برس کی عمر میں ابنِ حجر نے قرآن مجید حفظ کر لیا۔ فقہ اور حدیث کے علوم آپ نے عزالدین جماعۃ سے حاصل کیے اور علم القرأت علامہ التنوخی سے سیکھا۔ علمِ لسانیات کی تحصیل محب الدین ابن ھشام سے کی۔ حافظ صاحب کے تمام اساتذہ یگانۂ روزگار تھے اور اپنے اپنے شعبۂ علم میں امامت کا درجہ رکھتے تھے۔

حافظ ابنِ حجر کو ابتدا سے ہی علم حدیث سے زیادہ شغف تھا۔ اِسی علم کے حُصول کے لیے انہوں نے مصر و شام اور حجاز و یمن کے سفر کیے۔ وہاں کے علماء، حکماء، اُدباء، محدّثین، مُورخین اور لسانیات کے ماہرین سے ملاقات کی۔ اور اس طرح دس برس مختلف علمی مراکز سے استفادہ کر کے اپنے علم کی تکمیل کی۔ نیز درس دینے اور فتاویٰ جاری کرنے کی اجازت (سند) حاصل کی۔ تحقیق و تجسّس کا بھی قابلِ قدر جذبہ تھا جس نے ابنِ حجر عسقلانی کو علمائے اسلام کی صفِ اوّل میں لا کھڑا کیا۔

حافظ ابنِ حجر کی نیک نفسی اور تبحّر علمی کے پیشِ نظر اُنہیں بارہا منصبِ قضاۃ پیش کیا گیا۔ مگر انہوں نے اپنی آزادیٔ رائے اور حریّتِ فکر و ضمیر کے تحفّظ کی خاطر ہر مرتبہ پہلوتہی کی۔ آخر کار جمال الدین بلیغی کے بے پناہ اصرار پر قضاۃ کا عہدہ قبول فرمایا۔ اور محرّم ۸۲۷ھ میں قاضی القضاۃ کے منصبِ عالی پر فائز ہوئے۔ اگرچہ بعض اوقات اُنہیں اس عہدے سے خودداری کے باعث الگ ہونا پڑا۔ مگر بحیثیّتِ مجموعی اکیس ۲۱ برس تک اس عہدے پر فائز المرام رہے اور ۸۵۲ھ میں اپنے وطن میں وفات پائی۔

حافظ ابنِ حجر عسقلانی اپنے دَور کے بلند پایہ انشا پرداز، قادر الکلام شاعر، کثیر التصانیف محدّث اور نامور مؤرّخ تھے۔ علم حدیث میں ان کا مرتبہ اس امر سے ظاہر ہے۔ کہ مشرق و مغرب میں ان کی تالیف فتح الباری، صحیح بخاری کی بہترین شرح تسلیم کی جاتی ہے۔ علم تاریخ میں علامہ ممدوح کی دو کتابیں یادگارِ زمانہ ہیں "الاصابہ فی تمیز الصحابہ اور الدّرر الکامنہ فی عیان المائۃ الثامنہ۔

علامہ ابنِ حجر سے بہت پہلے محمد بن سعد (المتوفی ۲۳۰ھ) نے صحابہ اور تابعین کے حالات پر ایک جامع تالیف مرتب کی تھی جو انتہائی مستند مآخذ کا درجہ رکھتی ہے۔ ابنِ حجر نے اس کتاب سے پورا پورا استفادہ کیا اور نہایت بیش قیمت اضافوں کے ساتھ صحابہ کے حالات پر ایک عظیم و ضخیم تالیف سپردِ قرطاس کی۔ جس کا نام انہوں نے "الاصابہ فی تمیز الصحابہ" رکھا۔ جو سیرتِ صحابہ پر سب سے زیادہ مفصّل، مکمل مستند اور مبسوط تصنیف سمجھی جاتی ہے۔ اس تالیف کی ابتدا میں فاضل مؤرّخ نے صحابہؓ کے فضائل از رُوئے قرآن و حدیث بیان کیے ہیں۔ پھر نو ہزار چار سو چھپتر اکابر صحابہ کے حالات، حروفِ تہجی کی ترتیب سے سلسلہ وار درج کیے ہیں جنہیں پیغمبرِ اسلام کی صحبت کا شرف حاصل ہُوا اور جن سے احادیث بھی مروی ہیں۔ بعد ازاں اُن افراد کے حالاتِ زندگی بھی نقل کیے ہیں جن کے سنِ شعور تک پہنچنے سے پہلے حضور سرورِ کائنات فوت ہو چکے تھے اور جنہیں حضور اکرمؐ کی صحبت کے انوار سے فیض اٹھانے کی سعادت نصیب نہ ہو سکی۔ پھر اُن اصحاب کا بھی ذکر ہے جنہوں نے حضورِ انور اور آپ کے صحابہ کبار کا زمانہ تو پایا مگر خدمتِ رسولؐ میں حاضری دینے کی سعادت سے محروم رہے۔ آخر میں ان بزرگوں کے احوال درج ہیں جن کے بارے میں اہلِ علم کو کسی سبب مغالطہ پیدا ہو گیا تھا۔ کہ وُہ صحابئ رسولؐ ہیں حالانکہ انہیں یہ شرف حاصل نہیں رہا۔ ۱۳۲۸ھ میں مصر سے یہ نادر العصر تالیف چار جلدوں میں زیورِ طباعت سے آراستہ ہو کر منظرِ عام پر آئی۔ جو کم و بیش پانچ ہزار صفحات پر مشتمل ہے۔[1]

آپ کی دوسری تالیف "الدرر الکامنہ فی اعیان المائۃ الثامنہ" ایک یادگار تاریخی کارنامہ ہے۔ اس میں فاضل مؤرّخ نے، حروفِ تہجی کی ترتیب کی رعایت سے، عالموں، محدّثوں، مؤرّخوں کے سوانح حیات کے پہلو بہ پہلو بادشاہوں، وزیروں، حاکموں، امیروں اور ادیبوں کے حالاتِ زندگی اور کارناموں کا تفصیلی

---

[1] یہ کتاب چار جلدوں میں حیدر آباد دکن سے چھپ کر شائع ہو چکی ہے۔

تذکرہ پیش کیا ہے، جو آٹھویں صدی میں نامور ہوئے۔ اس طرح فاضل مؤلف نے آٹھویں صدی میں عالم اسلام کے تیرہ سو مشاہیر کے حالاتِ زندگی پر ایک بیش قیمت اور معلومات افزا قاموس چار جلدوں میں مرتب کر دی۔ جو مواد کی وسعت و گہرائی، حسنِ ترتیب اور جامعیت کے اعتبار سے بے مثل ہے۔ یہ مشاہیر چونکہ زیادہ تر ابنِ حجر کے ہم عصر ہیں یا قریب العصر ہیں۔ اس لیے اس دور کے بارے میں ابنِ حجر کی یہ گرانمایہ تالیف مستند ترین ماخذ کا درجہ رکھتی ہے۔

ان ہر دو تاریخی کتب کے علاوہ علمِ حدیث میں علامہ موصوف کی دو مشہور کتابیں "لسان المیزان" اور "تہذیب التہذیب" ہیں۔ اوّل الذکر میں چھ ہزار اور ثانی الذکر میں تین ہزار راویانِ حدیث کے حالات جمع کیے گئے ہیں۔

ابنِ حجر کی تصانیف کے علمی مرتبے کو سمجھنے کے لیے ہم شاہ عبدالعزیز دہلوی کی گراں قدر تالیف "بستان المحدثین" کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ جس میں انھوں نے ابنِ حجر عسقلانی اور جلال الدین سیوطی کی تالیفات کا موازنہ یوں فرمایا ہے۔

"ابنِ حجر کی تمام تصانیف اگرچہ تعداد میں زیادہ ہیں۔ لیکن ابنِ حجر کی تصانیف نسبتاً زیادہ ضخیم ہیں اور ان میں نئے نئے مضامین اور طبع زاد علمی نکات موجود ہیں۔"

مورخین لکھتے ہیں کہ ابنِ حجر عسقلانی نے تمام زندگی تصنیف و تالیف اور عبادت و ریاضت کے لیے وقف کر دی تھی۔ وہ کسی وقت خالی نہ بیٹھتے تھے۔ بلکہ تین مشاغل میں مصروف رہتے تھے۔ اوّل مطالعۂ کتب دوئم تصنیف و تالیف، سوئم عبادت و ذکر الٰہی! علم و عبادت میں اس درجہ انہماک کا ثمرہ یہ ہے کہ ابنِ حجر عسقلانی نے آنے والی نسلوں کے لیے، ڈیڑھ سو سے زیادہ غیر فانی کتب یادگار چھوڑی ہیں۔ جن کے مطالعہ سے علمِ حدیث اور علمِ تاریخ کا کوئی طالب علم بے نیاز نہیں رہ سکتا۔

یہاں اس امر کی طرف اشارہ کر دینا مناسب ہوگا کہ تاریخ انسانی میں پہلی مرتبہ مسلمانوں نے فنِ تاریخ کی ایک اہم شاخ "فنِ رجال" پر خصوصی توجہ دی ہے۔ چنانچہ مغربی محقق ڈاکٹر اسپرنگر نے ابنِ حجر عسقلانی کی تالیف کتاب الاصابہ کا جو ترجمہ انگریزی زبان میں شائع کیا ہے اس کے دیباچے میں لکھتے ہیں۔ "اگر مسلمانوں کے رجال کی کتابیں اکٹھی کر لی جائیں تو ہم غالباً پانچ لاکھ انسانوں کے سوانح حیات سے باخبر ہو جائیں اور ہم پر یہ امر واضح ہو جائے گا کہ ان کی تاریخ کا کوئی دس برس کا زمانہ ایسا نہیں گزرا اور نہ

کوئی مشہور مقام ایسا ہے جہاں کے علماء کا تذکرہ دستیاب نہ ہو۔ یہ بیش بہا تاریخی مواد اتنا زیادہ وقیع نظر آتا ہے جتنا زیادہ ہم اُن لوگوں کے (ادب وعلوم) میں جودتِ طبع کے نتائج سے آشنا ہوتے جاتے ہیں۔"

سخاوی

جس طرح مشرقی ممالک میں بغداد مسلمانوں کے علوم و فنون کا گہوارہ رہا ہے اسی طرح اندلس میں قرطبہ کا پایۂ تخت مشاہیر علم پیدا کرتا رہا ہے۔ ان میں سے ایک علامہ شمس الدین سخاوی ہیں جو ۸۳۱ھ میں قاہرہ میں پیدا ہوئے اور تمام مروجہ علوم پر کمسنی میں عبور حاصل کر لیا۔ قرآن، حدیث، فقہ، تاریخ اور ادب میں علامہ ممدوح یدِطولیٰ رکھتے تھے۔ آپ نے جن جید علمائے عصر سے فیض اُٹھایا ان میں ابن حجر عسقلانی کا نام سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ ابن حجر کی وفات کے بعد علامہ شمس الدین سخاوی زیارتِ خانہ کعبہ کے لیے تشریف لے گئے تو وہاں کئی چوٹی کے علماء سے استفادۂ علمی کیا۔ بالخصوص التقی بن فہد اور ابوالعادات بن ظہیر کی علمی رہ نمائی میں انھوں نے اپنے علم کی تکمیل کی اور وہاں سے واپس اپنے وطن قاہرہ لوٹ آئے اور تدریس و تالیف میں مشغول ہو گئے۔ علامہ سخاوی کو حج سے واپس آنے کے بعد "حرمین شریفین کی بے حد یاد آتی۔ چنانچہ ۸۷۰ھ سے مدینہ منورہ میں قیام پذیر ہو گئے اور دیارِ حبیبؐ میں تشنہ لبانِ علم کو اپنے چشمۂ علم سے سیراب کرتے رہے اور ۹۰۲ھ میں وفات پا کر مدینہ کی خاک پاک میں مدفون ہوئے۔ علامہ سخاوی وسیع الاطلاع بزرگ اور کثیر التصانیف عالم تھے۔ ان کی تین مشہور تصانیف یہ ہیں۔

الاعلان بالتوبیخ۔ جو عربی تاریخ نویسی کی پہلی مجمل لیکن محققانہ تاریخ ہے۔

الضَّوْءُ اللَّامع - نویں صدی ہجری کے مشاہیر کا درخشاں تذکرہ ہے۔

اَلْجَوَاهِرُ وَالدُّرَر۔ علامہ موصوف کے استاذ ابن حجر عسقلانی کی سوانح حیات ہے۔

علامہ موصوف نے فنِ تاریخ پر کُتب کے ذیل بھی لکھے۔

ذہبی کی تاریخ دول الاسلام کا ذیل۔

مقریزی کی کتاب السلوک کا ذیل۔

الاعلان بالتوبیخ میں تاریخ کی تعریف، فضیلت اور اقسام بیان کی گئی ہیں۔ اسی طرح علمِ تاریخ کی مختلف انواع اور ان میں طبع آزمائی کرنے والے مؤلفین کے سوانح نیز اُن کی تالیفات کے مقام و

مرتبے کو زیر بحث لایا گیا ہے۔

کتاب کے شروع میں علامہ سخاوی تاریخ کی یہ لغوی تعریف بیان کرتے ہیں "وقت کی نشاندہی" اور اس کا اصطلاحی مفہوم یوں بیان فرماتے ہیں "یہ وہ فن ہے جس میں سارے زمانے کے واقعات سے بحث کر کے ان کے وقت کا تعین کیا جاتا ہے"۔ علم تاریخ کا موضوع وہ انسان اور زمان دونوں کو قرار دیتے ہیں اور اس کے بعد وہ تاریخ کے علم کے فوائد پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"نبیوں، ولیوں، زاہدوں، سالکوں، کی خبروں سے انسان اپنے دنیاوی طرزِ عمل کی اصلاح کرتا ہے اور اپنی آخرت سنوارتا ہے"۔

"بادشاہوں کی سیاست اور حکومت کی ابتداء، ارتقاء اور زوال کے مطالعہ سے انسان کی عقل ترقی کرتی ہے اور وہ رفتہ رفتہ تجربہ کار ہو جاتا ہے"۔

"بلند کردار افراد کی سیرت پڑھنے سے یہ شوق پیدا ہوتا ہے کہ ہم بھی اُن کی پیروی کر کے اُن جیسے بنیں تاکہ ہمارا ذکرِ خیر بھی باقی رہے"۔

اس سلسلہ میں علامہ موصوف نے بہت سے اقوال کے حوالہ جات جمع کر دیئے ہیں جن سے علم تاریخ کی اہمیت و فضیلت ثابت ہوتی ہے۔ مثلاً اخبار دولِ اسلامیہ کے مؤلف لکھتے ہیں :۔

"اگر تاریخ سے صرف اتنی عبرت حاصل ہوتی کہ زمانہ ایک حال پر باقی نہیں رہتا اور تغیر و تبدل اس کی فطرتِ ثانیہ ہے۔ تو اتنا ہی کافی تھا۔ مطالعہ کرنے والے کا مقصد اسی سے پورا ہو جاتا۔ مگر اس کے فوائد بے حد و حساب ہیں۔ جس کے شائق کے نصیب میں اگر ایک طرف آنسوؤں کے موتی ہیں جو عبرت سے بہتے ہیں تو دوسری طرف فرحت افزا ہوا کے جھونکے ہیں جو نیک کاموں کے نیک انجام کا مژدہ سُناتے ہیں۔

البرازالی فرماتے ہیں۔ "یہ بہترین اور اعلیٰ ترین علم ہے ۔۔۔ اس کے فوائد ظاہر و باہر ہیں۔ یہ عبرت حاصل کرنے کا وسیلہ اور بصیرت بڑھانے کا طریقہ ہے۔ یہ ایک تحفہ ہے جو تمہیں گذری ہوئی قوموں کے روبرو لے آتا ہے۔ یہ ایک تفریح ہے جس کی بدولت دِل خوش ہو جاتا ہے اور زبان رواں ہو جاتی ہے"۔ وقِس علیٰ ہٰذا۔

کسی مورخ کے لیے کن اوصاف و شرائط کا حامل ہونا ضروری ہے۔ اس بارے میں علامہ سخاوی

رقمطراز ہیں کہ مورّخ یا تاریخ نویس :۔

(۱) عادل ہو۔ یعنی منصف مزاج اور قابلِ اعتبار ہو۔

(۲) صحت فہم اور صحت بیان کا پورا پورا اہتمام کرے۔

(۳) لوگوں کو ان کے صحیح مرتبے میں رکھے۔ کم مرتبہ افراد کو اونچا نہ اُٹھائے۔ بلند رتبہ لوگوں کو پست نہ کرے۔

(۴) دنیاوی عداوت، جنبہ داری، تعصّب اور ذاتی اغراض سے بچتا رہے۔

(۵) الفاظ کے صحیح محل استعمال کو بخوبی جانتا ہو۔ مبادا کسی کے سوانح لکھتے وقت اس کے قلم سے ایسا نازیبا لفظ نکل جائے جو باعثِ رسوائی ہو جائے۔

(۶) تقویٰ شعار اور پرہیزگار ہو کیونکہ متقی مورّخ چھان بین سے کام لیتا ہے اور بے پر کی اڑانے سے محترز رہتا ہے۔

(۷) گروہی اور فرقہ دارانہ عصبیّتوں سے اپنے دامن کو محفوظ رکھے۔

بلاشُبہ کتاب کا یہ حصّہ جو عقلی و نقلی دلائل سے آراستہ و پیراستہ ہے ہر دور کے مورّخین کے لیے سُرمۂ بصیرت کا کام دے سکتا ہے۔ اور عصرِ حاضر کے مسلمان تاریخ نویسوں کی خصُوصی توجّہ کا مستحق ہے۔

ان مباحث کے بعد علامہ شمس الدین تاریخ کی مختلف انواع و اقسام بیان کرتے ہیں اور ہر صنف کی تصانیف اور مؤلفین کے بارے میں تاریخی ترتیب کے مطابق بحث و گفتگو کرتے ہیں۔ مثلاً :۔

نبیوںؑ، خلیفوں، وزیروں، کاتبوں، امیروں، فقیہوں، قاریوں، حدیث کے حافظوں، محدثوں، مؤرّخوں، نحویوں، ادیبوں، لغت نویسوں، شاعروں، عابدوں، قاضیوں، مفتیوں اور طبیبوں کے بارے میں جو کتب تواریخ لکھی گئی ہیں ان کا وہ الگ الگ سلسلہ وار تذکرہ کرتے ہیں اور اِن تالیفات کے مؤلفوں کا اشارتاً تذکرہ کرتے جاتے ہیں۔

اس کے علاوہ بدعتیوں، اندھوں، کُبڑوں اور بخیلوں کے بارے میں بھی مؤرّخین اسلام کی تالیفات کا تذکرہ فرماتے ہیں۔ تاریخ کی ان جملہ اقسام و انواع اور ان کے ضمن میں تالیفات کی کثرت کو دیکھ کر یہ بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ علامہ ممدوح کے دور تک فنِ تاریخ نویسی کے میدان میں کتنی وسعت

پیدا ہو چکی تھی۔ قصہ کوتاہ! اعلان بالتوبیخ عربی تاریخ نویسی یا مسلم تاریخ نگاری کی پہلی مجمل لیکن مکمل تاریخ ہے۔

علامہ ممدوح کے علمی مقام و مرتبہ کے بارے میں شہاب خفاجی متوفی سنہ ۱۰۶۹ھ شرح شفا میں لکھتے ہیں:۔

"حفاظ و محدثین کی آخری یادگار حافظ سیوطی (متوفی سنہ ۹۱۱ھ) اور حافظ سخاوی (متوفی سنہ ۹۰۲ھ) ہیں۔

علاّمہ جلال الدّین سیُوطی

شیخ جلال الدین عبدالرحمان ابن ابی بکر سیوطی مصر کے مملوکی عہد کے وہ فاضل بے بدل ہیں جن کے مثل کوئی دوسرا عالم کثرتِ تصانیف کے اعتبار سے عربی زبان وادب کی تاریخ میں نہیں ملتا۔ تاریخ نگاری میں بھی ان کا رُتبہ نہایت بلند ہے اور آپ دسویں صدی ہجری کے سب سے ممتاز مؤرخ تسلیم کیے جاتے ہیں۔ ۸۴۹ھ میں قاہرہ کے معروف علمی گھرانے میں پیدا ہُوئے۔ ان کے والدِ محترم مدرسۂ شیخونیہ میں علم الفقہ کے مدرّس تھے۔ مبداءِ فیض سے اُنہیں بہت سی فطری خوبیاں اور کمالات عطا ہُوئے تھے۔ چنانچہ انہوں نے مصر کے اکابر اساتذہ سے بہت جلد علومِ مروّجہ میں کمال پیدا کر لیا۔ ۸۷۲ھ میں اپنے والدِ محترم کی جگہ مدرسۂ شیخونیہ میں مدرّس مقرر ہوئے۔ مختلف علوم میں مہارت رکھنے کی وجہ سے متنوّع مسائل پر قلم اُٹھایا۔ علاّمہ موصوف نے متقدمین کے منتشر ذخائرِ علمیہ کو عرق ریزی اور کاوش سے جمع کیا۔ سلیقے اور قرینے سے ترتیب دیا اور مجتہدانہ اضافوں کے ساتھ بڑے اختصار اور جامعیّت سے پیش کر دیا۔ متعارف علوم کا ایسا کوئی شعبہ نہ ہوگا جس پر آپ نے کوئی نہ کوئی کتاب نہ لکھی ہو۔ زمانۂ تصنیف سے ہی ان کی کتابوں اور رسالوں کو مقبولیّت حاصل رہی ہے انہوں نے درس و تدریس، افتاء و قضاء، تزکیہ و ہدایت کے جملہ کام اس خوش اسلوبی سے سرانجام دیئے کہ اہلِ نظر نے آپ کو دسویں صدی کا مجدّد قرار دے دیا۔ علم تفسیر، علم حدیث، لسانیات و ادبیات، صرف و نحو، علم تاریخ، علم اسماء الرجال، ان سب علوم پر آپ نے نہایت پُرمغز و عالمانہ کتابیں لکھیں۔

ہم یہاں صرف اُن کی علمِ تاریخ اسلام و سیرت پر اہم کتابوں کا ذکر کریں گے۔ علاّمہ موصوف نے "کنز العُمّال" میں مصر اور قاہرہ کے بارے میں بڑی مفید معلومات پیش کی ہیں۔ یہ کتاب مصر سے متعلق تاریخی معلومات کا ایسا قیمتی سرمایہ ہے جسے کوئی مورّخ نظر انداز نہیں کر سکتا۔

"نظمُ العُقبان فی اعیان الاعیان" میں انہوں نے نویں صدی ہجری کے تمام مشاہیر کے حالات

جمع کر دیئے ہیں۔

علمِ تاریخ میں آپ کی سب سے زیادہ مشہور تصنیف "تاریخ الخلفاء" ہے[1]۔ جس میں دسویں صدی تک کے خلفاء و سلاطینِ اسلام کے عہد بہ عہد حالات کا بیان موجود ہے۔ درسِ نظامیہ میں یہ کتاب آج تک شاملِ نصاب ہے۔ اس کتاب کی مقبولیت کا سبب حسنِ ترتیب و حُسنِ تبویب ہے۔ یہ مختصر سی تصنیف اتنی مکمل ہے کہ اسلامی تاریخ کا مشکل سے کوئی قابلِ ذکر واقعہ ایسا ہو گا جسے اس کتاب میں نظر انداز کیا گیا ہو۔ خُلفائے راشدین خلفائے بنو امیہ (دمشق) خُلفائے عباسیہ (بغداد و قاہرہ) خُلفائے بنو امیہ (اُندلس) سب کے ادوارِ حکومت کے سیاسی احوال کے پہلو بہ پہلو بیش قیمت تمدّنی اور ثقافتی مواد جمع کر دیا گیا ہے۔ بالخصوص اس امر کا التزام کیا گیا ہے کہ ان تمام مشاہیر کا ذکر کر دیا جائے۔ جنہوں نے کسی خلیفہ یا سلطان کے دَورِ حکومت میں وفات پائی ہو۔ "تاریخ الخلفاء" کو مرتّب کرتے وقت فاضل مورّخ نے اپنے تمام پیشرو مؤرخین کی مستند کتب سے استفادہ کیا ہے اور جا بجا ان کے حوالے بھی دیئے ہیں۔ جن میں سے طبری، الیعقوبی، مسعودی، ابن عبدالبرّ، ابنِ جوزی، الخطیب البغدادی، الصولی، ابن عساکر، کی تاریخی تالیفات خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ البتہ علامہ موصوف نے سب سے زیادہ استفادہ حافظ ذہبی کی تاریخ سے کیا ہے۔

تاریخ الخلفاء کی چند اہم خصوصیات درجِ ذیل ہیں:-

اوّل - جیسا کہ اس کتاب کے نام سے ظاہر ہے۔ یہ کتاب عہدِ خلافت کی تاریخ ہے اور دورِ نبوت سے اسے کوئی بحث نہیں۔ اسی لیے انبیائے سابقین اور سید المرسلین کے سوانح حیات قلم انداز ہو گئے ہیں۔

دوئم - "تاریخ الخلفاء" تاریخی نوادرات کی کشکول ہے۔ اس میں ایسے نادر علمی نکات جمع کر دیئے گئے ہیں جو شائد ہی کسی اسلامی تاریخ کی کتاب میں یکجا ملیں۔

سوئم - اس قابلِ قدر تالیف کا ایک وصف یہ ہے کہ کم سے کم صفحات میں زیادہ سے زیادہ معلومات پیش کر دی گئی ہیں۔ تاکہ جو لوگ تاریخ کا وسیع مطالعہ نہ کر سکیں وُہ اس تالیف سے خلافتِ اسلامیہ کے بارے میں ضروری معلومات حاصل کر سکیں۔

چہارم - خلفائے اسلام کی نجی زندگی کے متعلق دلچسپ حکایات (ANECDOTES) اور اُن کے اقوالِ

---

[1] سیوطی کی ایک اہم کتاب کتاب بدائع الظہور بھی ہے جو تاریخ الخلفاء کے انداز پر عام اقوامِ عالم کی عام فہم لیکن مختصر تاریخ ہے۔ (مؤلف)

زرین سے کتاب کو آراستہ پیراستہ کیا گیا ہے۔

پنجم۔ ہر خلیفہ کے دورِ حکومت میں جو عُلماء و فُضَلاء وفات پا گئے اُن کے اسمائے گرامی درج کیے گئے ہیں۔

ششم۔ خلفائے اسلام کے جاری کردہ سکّوں اور ان کی سرکاری مُہروں کی جا بجا تصریح کی گئی ہے۔

ہفتم۔ خلافتِ راشدہ کا بڑی شرح وبسط سے تذکرہ کیا گیا ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ فاضل مؤلف اس دَور کو تاریخ اسلام کا مثالی عہد سمجھتے تھے۔ اسی طرح اموی خلفاء میں سے عمر بن عبدالعزیز کے حالات زیادہ تفصیل سے لکھے گئے ہیں۔ معلوم ہوا کہ جلال الدین سیوطی کے تاریخ نگاری کے محرّکات زیادہ تر دینی، رُوحانی اور اخلاقی ہیں۔

ہشتم۔ ہر دور کے سیاسی احوال کے پہلو بہ پہلو، معاشرتی، ثقافتی اور تمدّنی پہلوؤں پر خاص توجہ دی گئی ہے۔

نہم۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ علامہ جلال الدین سیوطی نے محض پہلے مؤرخین کی کورانہ تقلید نہیں کی بلکہ ان کی بعض علمی غلطیوں پر گرفت بھی کی ہے۔ جو فاضل مؤلّف کی حرّیتِ فکر اور اجتہادی بصیرت کا بیّن ثبوت ہے۔

نابغۂ روزگار شخصیّتوں کو بالعموم اُن کے معاصرین خاطر میں نہیں لاتے۔ لیکن علّامہ جلال الدین سیوطی کے کارناموں کو ان کے معاصرین نے بھی سراہا ہے اور متاخرین نے بھی۔!

- چنانچہ ان کے معاصر مؤرخ شمس الدین محمد سخاوی نے "الضوءُ اللامع" میں آپ کا ذکر عقیدت و احترام سے کیا ہے۔
- مشہور تذکرہ نویس حاجی خلیفہ نے "کشف الظنون" میں آپ کی خدماتِ جلیلہ کا فراخ دلی سے اعتراف کیا ہے۔
- ملّا علی قاری جیسے جیّد عالم نے آپ کے کمالات گنوانے کے بعد یہ رائے دی ہے کہ علّامہ جلال الدین سیوطی دسویں صدی کے مجدد ہیں۔ دائرۃ المعارف اسلام میں لکھا ہے کہ دنیائے اسلام میں سیوطی
- کا سا علم و فضل اور ذوقِ تصنیف رکھنے والے لوگ کم پیدا ہوتے ہیں۔ مغربی محققین میں سے
- (Flügel) فلوگل آپ کی تصنیفات پر انگشت بدنداں ہے جن کی مجموعی تعداد پانچ سو اکسٹھ ۵۶۱ بتلاتا ہے۔

المقّری

علّامہ شہاب الدین ابوالعباس المقّری تلمسان کے ایک علمی خانوادے کے چشم و چراغ تھے۔ ابتدائی تعلیم اپنے وطن مالوف میں حاصل کی۔ فقہ، تفسیر، فلسفہ و منطق، تاریخ و ادب میں غیر معمولی شغف رکھتے تھے۔ تکمیلِ علم کی غرض سے مراکش اور ٹیونس تشریف لے گئے۔ پانچ مرتبہ حج بیت اللہ کی سعادت سے بہرہ مند ہوئے۔ قاہرہ میں دورانِ قیام صرف ایک برس میں اپنی قابلِ قدر تالیف "نفح الطیب من غصن الاندلسُ الرطیب" چار جلدوں میں مرتب فرمائی اور اسی سال داعی اجل کو لبیک کہی۔

علّامہ المقّری نے اسلامی ممالک کے سینکڑوں (یعنی ۲۳۷) علمائے کبار سے استفادہ کیا تھا۔ جن کے وہ اکثر حوالے دیتے ہیں، چنانچہ ان کی تالیف علّامہ مسعودی، ابنِ بطوطہ، ابنِ خلدون، ابنِ حزم ابن جزی، لسان الدین خطیب، ابن سعید۔ ابن حیان، ابن بشکوال، محمد بن موسیٰ الرازی جیسے محققین و مؤرخین کے حوالوں سے مُزیّن ہونے کے باعث اندلس کی تاریخ میں جملہ کتابوں پر فوقیت رکھتی ہے۔ باب اوّل میں علّامہ المقّری سرزمینِ اندلس کا عمومی تعارف پیش کرتے ہوئے علّامہ احمد بن محمد الرازی کے حوالے سے لکھتے ہیں:" سرزمین اندلس کی آب و ہوا بہت خوب ہے۔ یہ سارا علاقہ سرسبز و شاداب ہے۔ ہر سمت انہار و چشمہ ہائے شیریں رواں دواں ہیں۔ سال بھر موسم معتدل رہتا ہے، ربیع، خریف، سرما گرما، ہر موسم میں نسیم جاں فزا چلتی رہتی ہے۔ ہر وقت لذیذ و مفید پھل دستیاب ہیں۔ ساحل ہو یا نواحِ ساحل! ہر جگہ پھل دار درختوں کے خوشے عجب بہار دکھاتے ہیں۔ خود فاضل مؤلف اندلس کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں:" اندلس اپنی خوبیٔ آب و ہوا کے لحاظ سے "شام" ہے، فراست، ذہانت میں "چین" ہے۔ منافع سواحل میں "عدن" ہے، حکماء اور فلاسفہ کے وجود کی برکت سے "یونان" ہے۔ غرناطہ اندلس کا دارالسلطنت اور اسلام کا آخری حصار ہے، اشبیلیہ عیش و طرب کا مرکز ہے، قرطبہ علم اور علماء کا مدفن و مخزن ہے۔ اشبیلیہ کا عالم مرجاتا ہے تو اس کی کتابیں قرطبہ بکنے کو آتی ہیں۔ اور اگر کوئی قرطبہ کے ارباب نشاط میں سے مرجاتا ہے تو اُس کے آلاتِ طرب اشبیلیہ میں فروخت ہونے کو جاتے ہیں۔

شاطبہ کاغذ سازی کے لیے مشہور عالم ہے، اور طلیطلہ میلوں پھیلا ہوا ایک چمن زار ہے جو ہر خاص و عام کو دعوتِ نظارہ دیتا ہے۔

نظمِ مملکت کے بارے میں علامہ موصوف لکھتے ہیں: "اندلس میں بادشاہ کی اعانت و مشورت کے لیے ایک جماعت مقرر ہوتی ہے جس میں بادشاہ کسی موزوں ترین فرد کو اپنا نائب منتخب کر لیتا ہے۔ عوام اُسے وزیر کہتے ہیں۔ جبکہ اس کا شاہی خطاب حاجب ہوتا ہے۔ کچھ عرصے بعد ہر وہ شخص جو بادشاہ کا ندیم رہا وزیر کہلانے لگا۔ اور نائب خلیفہ کو ذوالوزارتین کا لقب ملا۔ وزارت سے کمتر عہدہ کاتب الرسائل (سیکرٹری) کا ہے۔ وزیرِ مالیات (اشغالِ خراجیہ) کا عہدہ بھی اہم ہے کہ تمام لوگوں کی نگاہیں اسی کی طرف اٹھتی ہیں۔ قضاۃ کا عہدہ بڑا پُروقار اور محترم ہے۔ یہاں تک کہ قاضی کے سامنے بادشاہ بھی جواب دہ ہوتا ہے۔ اندلس کے تہذیب و تمدّن کے بارے میں علامہ موصوف کا تجزیہ یہ ہے کہ اہل اندلس عمامہ بہت شاذ باندھتے ہیں۔ سپاہیوں کے ہتھیار، جھنڈے اور چار جامے (وردیاں) عیسائیوں جیسے ہیں۔ شیوخ و اکابر طیلسان (چغہ) زیبِ تن کرتے ہیں۔ اہل اندلس لباس کی... نظافت اور گھر کی صفائی میں دنیا کے تمام لوگوں سے فائق ہیں۔ یہاں تک کہ اگر کسی کے پاس بڑی قلیل رقم ہو تو وہ فاقہ کر لیتا ہے مگر صابون وغیرہ خرید کر اپنے کپڑے ضرور دھو لیتا ہے۔ اندلس کے لوگ روپیہ، پیسہ خرچ کرنے میں اعتدال پسند ہیں۔ جو کچھ ان کے پاس ہوتا ہے اُسے بڑی احتیاط سے خرچ کرتے ہیں تاکہ سوال کی ذلت سے بچ سکیں۔

دُوسرے باب میں المقریؔ نے اُندلس کی سیاسی تاریخ قلم بند کی ہے۔ وہ ہمیں تفصیل سے بتاتے ہیں کہ اُندلس کیونکر فتح ہوا؟ فتح و کامرانی موسیٰ بن نصیر اور طارق بن زیاد کے قدم کیسے چومے؟ اس کے بعد علامہ موصوف نے بنوامیہ کے بائیس گورنروں کی سلسلہ وار فہرست پیش کی ہے۔

تیسرے باب میں اندلس میں سطوتِ اسلام کی جلوہ آفرینی ہے۔ اور چودہ سلاطین کے دورِ حکمرانی کا تفصیلی تذکرہ ہے۔ اس کے بعد آلِ بنو احمر کی سلطنتوں کا اجمالی ذکر ہے۔ ان ادوار کو اندلس میں مسلمانوں کے عروج کا سنہری دور کہا جا سکتا ہے۔

چوتھے باب میں قرطبہ اور اس کے مضافات (زہراء اور زہراہ) کی عمارتوں کے تعمیراتی محاسن کا ذکر ہے۔ خصوصاً مسجد قرطبہ کے فنی محاسن کی دل کھول کر داد دی گئی ہے۔ جسے عبدالرحمان اوّل نے بنانا شروع کیا اور جس کی تزئین و تکمیل میں تمام اندلسی فرمانرواؤں نے منفرد و بھر حصّہ لیا۔

پانچویں باب میں ان مشاہیر اندلس کا تذکرہ ہے جو ممالک مشرقی سے اندلس میں آئے اور اس سرزمین میں مقیم و آباد رہے۔

المقری کی خوش مذاقی قابلِ داد ہے کہ ایک صحابیٔ رسولؐ مینذر کے بابرکت نام سے یہ باب شروع ہوتا ہے۔ پھر دس تابعین کے حالاتِ زندگی مختصراً پیش کیے گئے ہیں جن کے قدوم میمنت لزوم سے سرزمینِ اندلس سرفراز ہوئی۔ ان میں سرِ فہرست موسیٰ ابن نصیر کا نام نامی ہے۔

چھٹے باب میں اہلِ اندلس کی ذہانت و فطانت کو موضوعِ سخن بنایا گیا ہے۔ المقری لکھتے ہیں" اندلس کے لوگ نسب، عزت، علو، ہمت، فصاحتِ کلام، پاکیزگیٔ نفوس اور منکرات سے احتراز کرنے میں، (مسلمان) عربوں سے مشابہ ہیں۔ صفائی اور حسنِ مذاق، ذہانت و فطانت، حسن نظر اور جودتِ عقل، میں بغدادی معلوم ہوتے ہیں۔ چمن بندی اور گلشن آرائی میں یونانی ہیں۔ زراعت اور فلاحت میں بے عدیل ہیں اس کے بعد علامہ موصوف نے فن تفسیر، فقہ، لغت، شعر و سخن، طب، فلسفہ، ریاضی اور ہندسہ جیسے علوم و فنون میں مشاہیر علمائے اندلس کے حالات سپردِ قلم فرمائے ہیں۔ نیز ان خواتین اسلام کا تذکرہ کیا ہے جنھوں نے مختلف علوم و فنون میں نام پیدا کیا۔ ان تاریخی شواہد سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اندلسی خواتین مردوں سے علم و فضل میں پیچھے نہ تھیں۔

ساتویں باب میں اندلس میں مسلمانوں کے زوال کا کرب انگیز مضمون ہے۔ فاضل مؤلف نے تفصیل سے لکھا ہے کہ ستم کیش عیسائیوں نے برسرِ اقتدار آنے کے بعد مسلمانوں کی عبادت گاہوں، تاریخی عمارتوں، تہذیبی علامتوں کو مٹانے میں کوئی دقیقہ نہ فروگذاشت کیا۔ مزید برآں اُنھوں نے بڑے منطقی انداز میں ان اسباب و علل کا تجزیہ فرمایا ہے جو مسلمانوں کے زوال کا موجب ہوئے۔ یہ باب جہاں لرزہ خیز واقعات سے پُر ہے وہاں عبرت انگیز اور نصیحت آموز بھی ہے۔

ابنِ حیّان کے حوالے سے علامہ موصوف نے لکھا ہے کہ" اُس زمانے میں اہلِ اندلس اپنے خالق کی طاعت و بندگی سے غافل ہو گئے۔ اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وصیّت کو فراموش کر بیٹھے۔ اپنے ملک کی مضبوطی سے غافل رہے۔ حتیٰ کہ دشمن سروں پر آن پہنچے اور ان کے شہروں پر ٹوٹ پڑے۔ علامہ مقرّی کا اپنا تجزیہ یہ ہے کہ اُمراء اور علماء کسی معاشرے میں بمنزلہ نمک کے ہوتے ہیں۔ بدبختی سے اندلس کے اُمراء خود پسندی میں

مبتلا ہو کر صراطِ مستقیم سے ہٹ گئے اور علماء شکم پروری میں ایسے مبتلا ہوئے کہ اپنے فرضِ منصبی سے منزلوں دُور ہو گئے۔

رہے عوام تو وہ کام و دہن کی لذتوں کی تسکین اور اعلیٰ ملبُوسات کی نُمائش اور سفلی خواہشات کی تسکین میں مبتلا ہو گئے۔ تا آنکہ اہلِ توحید، مدّعیانِ تثلیث سے شکست کھا گئے اور اُندلس میں ایسے جابر اسلام دشمن حکمران مسلط ہو گئے جنہوں نے اِسلام کے معابد و آثار کو بیخ و بُن سے اُکھاڑ پھینکا اور مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا۔

حاجی خلیفہ یا کاتب چلبی

مصطفیٰ ابن عبداللہ المعروف حاجی خلیفہ والملقب کاتب چلپی گیارھویں صدی ہجری کے مشاہیر اسلام میں سے ایک ہیں جو ترکی فوج میں ایک اعلیٰ عہدیدار ہونے کے دوش بدوش عالم اقتصادیات ممتاز ہیئت داں اور عظیم محقق و مورخ بھی تھے۔ ان کی شہرت کا تمام تر دارومدار ان کی "تذکرہ نگاری پر ہے۔ خصوصاً کشف الظنون ان کی یادگارِ زمانہ تصنیف ہے۔

حاجی خلیفہ سنہ ۱۰۱۷ھ میں قسطنطنیہ کے مقام پر پیدا ہوئے۔ چودہ برس کی عمر میں فوج میں سلحدار (فوجی منصب) کی حیثیت سے بھرتی ہوئے۔ سنہ ۱۰۳۳ھ سے سنہ ۱۰۴۵ھ تک مختلف فوجی مہموں میں شریک ہوئے۔ اور ہر معرکے میں غیر معمولی شجاعت کے جوہر دکھائے۔ جن پر عثمانی افواج آج بھی فخر کرتی ہیں۔ ان کی زندگی پیہم جدوجہد اور شاندار کامیابیوں کا عمدہ نمونہ ہے۔

سنہ ۱۰۴۳ھ میں حاجی خلیفہ کو حج کی سعادت نصیب ہوئی۔ اسی دوران وہ خلیفہ کے سیکرٹری (کاتب فی النظارۃ الجیش) مقرر کیے گئے اور پھر ادارۂ مالیہ کے نگران مامور ہوئے۔ ان دونوں مناصب (عہدوں) کی وجہ سے فاضل محقق "کاتب چلپی" اور "حاجی خلیفہ کہلائے۔

حاجی خلیفہ بڑا ستھرا علمی ذوق رکھتے تھے۔ چنانچہ کئی عہدوں کی یکے بعد دیگرے ذمہ داری سنبھالنے کے باوصف انہوں نے عربی، فارسی اور ترکی ان تینوں زبانوں میں تالیفات مرتب فرمائیں جن میں عالمانہ تحقیق کی خاص شان پائی جاتی ہے۔

فن تفسیر کے موضوع پر ان کی دو تالیفات تھیں۔ جن میں سے حاشیہ تفسیر بیضاوی دستیاب ہے۔ علم ہیئت کے موضوع پر ان کی دو کتابیں مشہور ہیں ایک "جہاں نما" دوسری حاشیہ محمدیہ۔

اوّل الذکر تالیف انہوں نے عثمانی خلیفہ سلطان محمد چہارم کے نام منسوب کی تھی۔ مالیات کے موضوع پر ان کی تصنیف "دستور الاعمال" تھی جس میں انہوں نے چند مالیاتی تجویزیں پیش کی تھیں۔ علم کلام کے بارے میں ان کی ترکی زبان میں تصنیف "میزان الحق" ہے۔ ادبیات میں ان کی تالیف تحفۃ الاخیار "پند و نصائح

ایک جامع تالیف ہے۔

علامہ موصوف کو علم تاریخ سے بڑا شغف تھا۔ چنانچہ انہوں نے اس فن میں کئی کتابیں لکھ ڈالیں۔ "لوامع النور" میں تقریباً ۱۵۰ شاہی خاندانوں کی تاریخ ہے۔ "رونق السلطنت" قسطنطنیہ کے حالات پر روشنی ڈالتی ہے "سُلّم الوصول الی طبقاتِ الفحول" مشاہیرِ اسلام کے سوانح کا دلکش مرقّع ہے اور تذکرہ نگاری کے فن میں نہایت قیمتی کتاب ہے۔ "تحفۃ الکبار فی اسفار البحار" میں دولتِ عثمانیہ کی بحری فتوحات کا بیان ہے۔

یہ سب کتابیں اپنی جگہ بڑی عمدہ اور معلومات افزا ہیں۔ لیکن حاجی خلیفہ کی شہرت کا انحصار تمام تر اپنی تصنیف "کشف الظنون عن اسامی الکتب والفنون" جیسی لافانی تالیف ہے۔ اُصولی طور پر یہ تالیف عربی تصانیف کے ناموں سے بحث کرتی ہے۔ لیکن اس میں ضمنی طور پر بعض فنون اور علوم پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ یہ کتاب دو ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے جن میں چودہ ہزار پانچ سو کتابوں ۱۴۵۰۰ کا ذکر ہے۔ جو الحاج موصوف کے زمانے تک جملہ علوم و فنون کی مختلف شاخوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کتاب کو اوّل تا آخر حروفِ تہجّی کے لحاظ سے مرتب کیا گیا ہے تاکہ قارئین کو مطالعے میں سہولت رہے اسلامی کتابوں کی اس جامع دائرۃ المعارف میں معروف کتابیں بھی زیرِ بحث آگئی ہیں اور غیر معروف کتابیں بھی درج ہیں۔ اہم کتابوں کے مؤلفین کے حالات کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ اور غیر معروف کتابوں کے لکھنے والوں کا اجمالی ذکر ہے۔ کشف الظنون میں الحاج موصوف نے ہر شعبۂ علم و فن پر، . . . . تیسری صدی ہجری کی ابتدا سے لے کر دسویں صدی ہجری کے آخر تک تمام معروف مطبوعہ کتابوں اور قلمی نادر نسخوں کی جامع فہرست مرتب کرکے آنے والی نسلوں پر بڑا احسان کیا ہے۔ بعض اصحاب کا خیال ہے کہ اس کتاب کا واحد ماخذ طاش کبری زادہ کی کتاب مفتاح السعادۃ و مصباح السیادۃ ہے جو صاحبِ موصوف نے علوم اسلامیہ پر سن وار ترتیب دی تھی۔ مگر وہ . . . . یہ حقیقت فراموش کر گئے ہیں کہ اوّل الذکر کتاب بلحاظِ مواد کشف الظنون کا عشرِ عشیر بھی نہیں۔

کشف الظنون کے بارے میں اہلِ نظر کی رائے ہے کہ یہ کتاب عہدِ اسلامی کے علوم و فنون پر جملہ کتابوں کی سب سے بڑی ، سب سے مکمل اور سب سے اعلیٰ فہرست کی حیثیت رکھتی ہے۔ جس میں علمی تصانیف اور مصنف دونوں کے بارے میں نہایت معیاری معلومات دلچسپ پیرائے میں جمع کر دی گئی ہیں۔

مصری محقق خیر الدین زرکلی اپنی تصنیف "الاعلام" میں لکھتے ہیں کہ کشف الظنون عربی زبان میں سب سے

زیادہ جامع اور نافع تذکرہ ہے۔

دائرۃ المعارف اسلام کے مقالہ نگار نے "حاجی خلیفہ" کے عنوان کے تحت لکھا ہے کہ "کشف الظنون کی ترتیب اور تصنیف میں الحاج موصوف نے بیس برس سے زیادہ مدت صرف کی اور ایک لاجواب تالیف یادگار چھوڑی"۔ بعض تاریخی روایات سے پتہ چلتا ہے کہ حاجی خلیفہ کا اپنا ذاتی کتب خانہ تھا جس میں علوم اسلامی پر بے شمار کتابیں جمع تھیں اور یہ بات یقینی ہے کہ کاتب چلبی نے اپنے دور کے بھی بڑے بڑے کتب خانے دیکھے تھے۔ خصوصاً قسطنطنیہ کی سب لائبریریوں کی خاک چھانی تھی۔ تب کہیں جا کر وہ "کشف الظنون" جیسی تالیف مرتب کرنے کے قابل ہوئے۔

اس کتاب کی افادیت کو اس جاندار مفصل مقدمے نے چار چاند لگا دیئے ہیں جو پہلی جلد کے شروع میں درج ہے اور چار ابواب پر مشتمل ہے۔ ان ابواب میں کئی انوکھے مباحث درج کیے گئے ہیں مثلاً علم کی تعریف کیا ہے؟ علم کی ماہیت اور حقیقت کے بارے میں ارباب علم وفضل کے مابین کیا کیا اختلافات ہیں؟ عربوں نے علوم کی تقسیم وتنظیم کس طرح اور کس انداز سے کی ہے؟ علوم کا اضافی مقام ومرتبہ کیا ہے؟ اہلِ اسلام نے کن علوم پر خصوصی توجہ دی ہے؟ اور کون کون سے علوم وفنون از خود ایجاد کیئے ہیں؟ اُن علوم میں نامور مصنفین کون کون سے ہیں اور ان کی تالیفات کس پائے کی ہیں۔ مؤلفین کا علمی رُتبہ کیا ہے؟ وغیرہ۔

غرضیکہ مسلمانوں کے علوم وفنون کے سرچشموں، اور نشو وارتقاء کے بارے میں بڑی بیش قیمت معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ ہماری رائے یہ ہے کہ حاجی خلیفہ ایسے مجاہد وعالم ہیں جن کے بارے میں یہ طے کرنا مشکل ہے کہ اُن کی بحری فتوحات زیادہ ہیں یا علمی فتوحات؟ تاہم یہ مسلّم ہے کہ علم اور شجاعت دونوں اوصاف ان کی ذاتِ گرامی میں بدرجہ کمال جمع تھے۔ جس کی نظیر دنیا کی دوسری اقوام کے مشاہیر میں شاذ ہی دیکھنے میں آئے!

اختتامیہ

ظہورِ اسلام سے قبل عربوں کے پاس کوئی تاریخی سرمایہ موجود نہ تھا۔ ان سے پہلے یونان کے مؤرخین تاریخ کے میدان میں دادِ تحقیق دے چکے تھے۔ اسی طرح اگر تجسّس اور تفحّص سے کام لیا جائے تو یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جائے گی کہ مسلمان محققین و مترجمین نے علمِ تاریخ کے موضوع پر نہ یونانی کتب کا ترجمہ کیا نہ اُن سے استفادہ کیا۔ سب جانتے ہیں کہ علم طب میں مسلمانوں نے یونانی اطبار کی تحقیق سے فائدہ اٹھایا۔ اور اپنے استفادے کا اعتراف کرتے ہوئے اسلامی طب کا نام ہی "یونانی طِب" رکھ دیا۔ بنا بریں اگر مسلمانوں نے اہلِ یونان سے فنِ تاریخ نویسی میں کچھ اخذ کیا ہوتا تو وہ ضرور اس کا فراخ دلی سے اقرار کرتے۔ ہمارے نزدیک عربوں کے ہاں تاریخ نگاری کے فن کا وجود اُن کی مجتہدانہ بصیرت اور تخلیقی صلاحیتوں کا مظہر و عکاس ہے۔ جنہیں قرآن حکیم کی تعلیم اور رسول کریم کی رہنمائی نے جلا بخشا تھا۔ تاریخ شاہد ہے کہ نہ مسلمانوں کو ایّامِ جاہلیت سے تاریخی سرمایہ ورثے میں ملا اور نہ انہوں نے دوسری قوم سے اس شعبۂ علم میں فیض پایا۔

سرکاری دباؤ سے بے نیازی :-

مسلمان مؤرخین نے بنیادی طور پر اپنی قوم کے مشاہیر کی یاد دل کو زندہ رکھنے اور اپنی قوم و ملت کی معلومات میں وسعت پیدا کرنے کی غرض سے تالیفات مرتّب کیں۔ شعبۂ تاریخ میں بہت کم ایسی کتابیں لکھی گئی ہوں گی، جن کا مقصود بادشاہوں سے انعام و اکرام حاصل کرنا ہو۔ مسلمان قوم کے ہاں ایسے مؤرخین کی مثالیں بہت شاذ ہیں جو کسی حاکم یا فرمانروا کے دربار سے باقاعدہ وابستہ رہے ہوں اور انہوں نے اس کی فرمائش کی تعمیل میں یا اس کی خوشنودی کی خاطر کوئی تاریخی تالیف سپردِ قلم کی ہو والشاذ کالمعدوم !

یہ درست ہے کہ ابراہیم صابئی نے عضدالدولہ کی فرمائش پر، اور عُتبی نے تاریخ یمینی حاکم وقت کے حکم سے مرتب کیں۔ یا ابن طقطقی نے اپنی تالیف فخرالدین عیسیٰ حاکم بصرہ کے نام معنون کی مسلمانوں کے ہاں مؤرخین کا ایک ان گنت سلسلہ ہے جو آزادانہ طور پر اپنی تالیفات قلم بند کرتے رہے۔

مثلاً طبری، یعقوبی، مسعودی، ابن خطیب، اور ابن خلدون وغیرہ۔

حُریتِ فکر و آزادیٔ رائے :۔

امام طبری نے نہ صرف حریتِ فکر و اظہارِ رائے کے لیے سرکاری مناصب کو پائے استحقار سے ٹھکرا دیا بلکہ جس خلیفہ (ابن المعتز) کے زمانے میں تاریخ الرسل والملوک مکمل کی اس کی تعریف و ستائش میں ایک حرف نہ لکھا۔ ابن مسکویہ نے عضدالدولہ کے دَور میں اپنی فاضلانہ تالیف "تجارب الامم" لکھی۔ لیکن اپنے محسن و مربی کی شخصیت کے روشن پہلوؤں کو زیرِ بحث لانے کے ساتھ ساتھ اس کی سیرت کے کمزور پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالی۔ ابن قتیبہ عباسی دَور کا مورّخ ہے۔ لیکن وہ عباسی خلفاء کی نسبت اُموی خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کا زیادہ مدّاح و معترف ہے۔ اور وہ عباسی خلفاء کی ناراضگی خاطر میں نہیں لایا۔ اسی طرح وُہ اُموی خلیفہ ہشام بن عبدالملک کے دور میں انصاف اور رعایا پروری کا ذکر کرتا ہے اور اُسے عباسی فرمانرواؤں کے احتساب و مؤاخذے کا اندیشہ لاحق نہیں ہوتا۔

ابنِ حجر عسقلانی کو بارہا قاضی القضاۃ کے منصب سے ہاتھ دھونا پڑا۔ لیکن انہوں نے حق گوئی اور بے باکی کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔

سنین کے بیان کا التزام :۔

مسلمان مؤرخین کو تاریخ میں یہ شرف و امتیاز حاصل ہے کہ انہوں نے ہر واقعے کے ساتھ اس کی تاریخ وقوع کی صراحت کی ہے۔ اور ابتدائی دَور کے جملہ مؤرخین، سن، مہینہ اور تاریخ درج کرنے کا اہتمام کرتے ہیں (مثلاً طبری، مسعودی وغیرہ)، اس کے برعکس مغربی تاریخ نگاروں نے سولہویں صدی سے پہلے اپنی تاریخی تالیفات میں سنین و تاریخ کی تصریح کا کبھی التزام نہیں کیا۔ جیسا کہ فاضل مستشرق بکل نے اپنی محققانہ تصنیف تاریخ تہذیب میں یوں اعتراف کیا ہے کہ :۔

"یونان کے مورّخ ہوں یا روما کے تاریخ نویس یا بائیبل کے شارح! ان میں سے کسی نے سنہ ۱۵۹۷ء سے پہلے ماہ و سنین لکھنے کا اہتمام نہیں کیا۔"

اسناد کے بیان کا اہتمام :۔

تاریخ عالم میں صرف مسلمان مؤرخین نے یہ التزام کیا ہے کہ کسی واقعہ کے راوی یا راویوں کا تذکرہ کیا جائے۔ اور اگر کوئی واقعہ مختلف سلسلوں سے پہنچتا ہے تو ان تمام سلسلوں کا تذکرہ کیا جائے یونانی اور رُومی مؤرخین کی کتابیں آج ہمارے سامنے ہیں۔ بالیقین ان میں کوئی ایک مؤرخ بھی ایسا نہیں جس نے اپنی معلومات کا اصل مآخذ بیان کیا ہو لیکن طبری، بلاذری اور تنوخی کی فنِ تاریخ کی کتابوں پر سرسری نظر ڈالیے تو آپ کو ہر جگہ روایت سے پہلے راوی (راویوں) یا سلسلۂ اسناد کا تذکرہ ملے گا۔ عقل محوِ حیرت ہے کہ مؤرخینِ اسلام نے کس طرح ابتدائی دَور میں ہی ہر واقعے کے چشم دید راوی یا راویوں کے نام محفوظ کر دیئے! نیز کسی واقعے کے صحیح محلِ وقوع اور اس کی تاریخ وقوع کا تعین کیا۔ قانونِ شہادت انسانی معاشرے اور عدالتوں میں صدیوں سے برتا جاتا تھا۔ لیکن مسلمان ہی وہ پہلی قوم ہیں جنہوں نے اس قانونِ شہادت کو علمِ حدیث اور علمِ تاریخ دونوں پر منطبق کیا۔ اور ہر تاریخی واقعے کے چشم دید اور گوش شنید گواہ تلاش کرنے کی سعی کی جس کی بدولت تاریخ داستانوں اور اور افسانوں کی سطح سے بلند ہو کر قابلِ اعتماد اور لائق استناد حقائق کا مجموعہ و مرقع بن گئی۔ لاریب تاریخ کا یہ وہ بلند معیار ہے جس پر آج بھی دنیا کی کوئی مہذب و متمدن قوم نہیں پہنچ سکی۔

آفاقیت :۔

دنیا کی اکثر و بیشتر قوموں کو صرف اپنی تاریخ پر فخر رہا اور ہمیشہ دوسری اقوام کو نظر انداز کرتی رہی ہیں۔ لیکن مؤرخینِ اسلام نے آدم سے لے کر دنیا کی تمام قدیم اور ہم عصر اقوام کے حالات کو علی الترتیب بیان کیا۔ کیونکہ وہ تمام مخلوق انسانی کو خدا کا کنبہ سمجھتے تھے۔

بنی آدم اعضائے یک دیگر اند ؎

مسلمانوں کے ابتدائی مؤرخین میں سے دینوری نے عربوں کے علاوہ عجمیوں کے حالات قلم بند کر کے تاریخ میں آفاقیت پیدا کر دی ہے۔

علامہ طبری نے اپنی کتاب کی تمہید میں انبیائے سابقین کے حالات بھی بیان کیے اور مختلف قوموں کے نامور سلاطین (خصوصاً ساسانی دور) کے مفصل احوال قلم بند کیے۔ عالمگیر تاریخوں کے سلسلے میں سب سے زیادہ شہرت رشید الدین بن فضل اللہ کی تاریخ کو حاصل ہے کہ جنہوں نے مسلمان خلیفوں کے ساتھ

عیسائی رہنماؤں، بادشاہوں کے ساتھ پیغمبروں اور مسلمانوں کے ساتھ رومی، وزنطینی، ہندی وچینی ایرانی وتورانی قوموں کے مفصّل حالات بڑی محنت وعرق ریزی سے جمع کیے اور بڑے سلیقے اور قرینے سے مرتّب کر دیئے۔

تالیفات کی تدریس :-

مسلمان مورخین اس لحاظ سے بھی اپنی مثال آپ ہیں کہ اپنی تصانیف کا خود درس دیا کرتے تھے یا پھر ان کے لائق ترین شاگرد درس دیتے جنہیں باقاعدہ اپنے استاذ کی طرف سے اجازت حاصل ہوتی۔ اس تدبیر کی بدولت تاریخ کی کتب کے مسخ ہونے، یا ان کے مضامین ومطالب کے خلط ملط ہونے کا اندیشہ جاتا رہا۔ اور اس قابلِ تحسین روایت کی بدولت یہ شعبۂ علم یگانوں کی غفلت شعاریوں اور بیگانوں کی دسیسہ کاریوں سے محفوظ ومصئون ہوگیا۔ آج بھی ہمیں اچھی طرح سے معلوم ہے کہ کون لوگ علامہ طبری سے "کتاب الرسل والملوک" کا درس سننے کے لیے حاضر خدمت ہوتے تھے۔ مثلاً ابنِ اثیر مؤلفِ الکامل نے ان کے سامنے زانوئے تلمذ بھی تہ کیا اور اُن سے روایت کی باقاعدہ اجازت بھی لی۔

تاریخ پر حکیمانہ نظر :-

مسلمانوں کے ہاں اہلِ یورپ سے صدیوں پہلے تاریخ پر حکیمانہ وفلسفیانہ انداز میں غور وفکر کرنے کا رجحان پایا جاتا ہے ابنِ مسکویہ کی "تجاربُ الامم"، ابنِ طقطقی کی کتاب "الفخری" ابن خلدون کا مقدمہ، یہ تالیفات اس دعویٰ کے بیّن ثبوت ہیں۔ ان مؤرخین نے پہلی مرتبہ نہ صرف تاریخ کے اصولی مباحث متعیّن کیے اور واقعات میں علّت ومعلول کا رشتہ جوڑا۔ بلکہ قوموں کے عروج وزوال کے اسباب ومحرکات پر بھی غور کیا اور ماضی کے تجربات کے آئینے میں حال کی اصلاح ومستقبل کی تعمیر کے لیے عاقلانہ اور دانشمندانہ مشورے دیئے۔

سرمایۂ تاریخ کی جستجو :-

مسلمان مؤرخین نے تاریخ کا سرمایہ جمع کرنے کے لیے، جہاں کشائی اور جہاں گردی کی ایسی شاندار روایات چھوڑی ہیں جن کی نظیر اقوامِ عالم کے ہاں شاید ونباید ملے۔ ہم یہاں مسعودی کی تالیف "التنبیہ الاشراف" سے ایک اقتباس نقل کرتے ہیں "جو شخص اپنے گھر سے باہر کبھی نہ نکلا ہو۔ بلکہ

اتنے ہی مبلغ علم پر قناعت کرے جو اُسے خود اپنے ملک کی تاریخ کے بارے میں حاصل ہو تو وُہ اس شخص کی برابری کا دعویٰ نہیں کر سکتا کہ جس نے اپنی تمام عمر حضر کی بجائے سفر میں بسر کی ہو۔ جس نے اپنی زندگی کے شب و روز صحرا نوردیوں اور کشور گردیوں میں گذارے ہوں اور جس نے ہر طرح کی حیرت انگیز معلومات اور گراں مایہ اطلاعات بہم پہنچائی ہوں۔"

کثرتِ تالیفات :۔

مسلمانوں کے تاریخی ادب کی بے پایاں وسعت، اور تالیفات کی کثرت کا صحیح اندازہ کرنا بڑا دشوار کام ہے۔ چنانچہ علامہ مسعودی نے مروج الذہب میں اپنے پیشرو اسّی مؤرخین کا تذکرہ کیا ہے۔ جن کی تالیفات سے انہوں نے استفادہ کیا۔ محمد اسحاق ابن ندیم نے "کتابُ الفہرست" میں سینکڑوں تاریخی کتابوں کی فہرست پیش کی ہے۔ آٹھویں صدی ہجری میں حافظ ذہبی نے علمِ تاریخ کی چالیس اقسام پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ اور حافظ مغلطائی نے اپنے دور میں ایک ہزار تاریخ کی کتابوں کی صرف ایک کتب خانے میں ورق گردانی فرمائی۔ حافظ سخاوی نے۔ علمِ تاریخ کے فوائد پر ایک رسالہ بعنوان "الاعلان بالتوبیخ لمن ذم التاریخ" تحریر فرمایا جس میں اُنھوں نے سینکڑوں مورخین کا اجمالی تذکرہ فرمایا ہے۔ جرمن مستشرق ویسٹن فلیٹ نے پہلی دس صدیوں کے مؤرخین اسلام کی تالیفات کا جائزہ لیتے ہُوئے تخمینہ لگایا ہے کہ ان کی تعداد پانچ سو نوے تک پہنچتی ہے۔ ان گوناگوں اعداد و شمار سے مسلمانوں کی علمِ تاریخ میں گراں قدر خدمات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

ضمیمہ

انواع واقسامِ تاریخ :-

اِس ضمن میں ہم علامہ بخاری کی تالیف "الاعلان بالتوبیخ" کا ایک طویل اقتباس نقل کرتے ہیں۔ جس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں نے تاریخ کی کتنی گونا گوں اقسام اور انواع پر قلم اُٹھایا۔ علامہ موصوف لکھتے ہیں کہ میں نے مستند مؤرخ حافظ ابو عبداللہ الذہبی کی اپنے ہاتھ کی تحریر دیکھی ہے جس کا متن یہ ہے۔ "میری جامع بڑی تاریخ (التاریخ الکبیر المحیط) جس میں میں نے اپنا پورا زور صرف نہیں کیا ورنہ وہ چھ سو جلدوں میں پھیل جاتی اس میں تاریخ کے مندرجہ ذیل فنون شامل ہیں :-

۱ - ہمارے نبی (صلعم) کی سیرت -

۲ - انبیاء (سابقین) کے قصّے -

۳ - صحابۂ کرام کی تاریخ -

۴ - خلفاء کی تاریخ جو صحابہؓ میں سے اور بنو اُمیّہ اور بنو العباس میں سے ہوئے -

۵ - بادشاہوں، بادشاہتوں اور کسریٰ و قیصر کے خانوادوں کی تاریخ - اسی ذیل میں شاہانِ اسلام بھی آتے ہیں - جیسے ابن طولون، ابن بُویہ، ابن سلجوق وغیرہم -

۶ - وزیروں کی تاریخ -

۷ - امیروں - کبیروں، نوابوں اور بڑے بڑے کاتبوں کی تاریخ -

۸ - فقیہوں، مذاہب کے نمائندوں، مختلف زمانوں کے اماموں اور فرائض کے ماہروں کی تاریخ -

۹ - ساتوں قراءتوں کے ماہر قاریوں کی تاریخ -

۱۰ - حفّاظِ حدیث کی تاریخ -

۱۱ - حدیث کے اساتذہ اور اماموں کی تاریخ -

۱۲ - مؤرخین کی تاریخ -

۱۳ - نحویوں، ادیبوں، لغت کے عالموں، شاعروں اور بلاغت، عروض اور حساب

کے ماہروں کی تاریخ۔

۱۴۔ عابدوں، زاہدوں، اولیا، صوفیاء اور عبادت گزاروں کی تاریخ۔

۱۵۔ قاضیوں اور والیوں کی تاریخ۔

۱۶۔ معلّموں، ورّاقوں (ہاتھ سے لکھ کر کتابیں بیچنے والوں) قصّہ خوانوں کوچہ گرد لوگوں کی تاریخ۔

۱۷۔ واعظوں، خطیبوں، نغمہ سراؤں، ندیموں، مطربوں کی تاریخ۔

۱۸۔ شریف، سخی، عقلمند، ذہین (ذکی) اور دانشمند (حکیم) لوگوں کی تاریخ۔

۱۹۔ طبیبوں، فلسفیوں، زندیقوں، انجینروں (مہندسین) اور ایسے ہی دیگر لوگوں کی تاریخ۔

۲۰۔ متکلّمین کے فرقوں کی تاریخ۔

۲۱۔ شیعہ کی تاریخ۔

۲۲۔ ہوا پرست لوگوں کی تاریخ۔ مثلاً خوارجی و ناصبی۔

۲۳۔ سُنّی عُلماءِ اُمّت، صوفیہ، فُقہا اور محدّثین کی تاریخ۔

۲۴۔ بخیل، طُفیلی، پیٹو، احمق، مغرور اور بے وقوف لوگوں کی تاریخ۔

۲۵۔ نابینا، اپاہج، بہرے، گونگے اور کبڑے لوگوں کی تاریخ۔

۲۶۔ منجّم، ساحر، کیمیائی، خزانہ جو اور شعبدہ باز لوگوں کی تاریخ۔

۲۷۔ انساب اور اخبار کے ماہرین کی تاریخ۔

۲۸۔ بہادروں، شہسواروں اور چابک دست، پھرتیلے لوگوں کی تاریخ۔

۲۹۔ تاجروں، حیرت انگیز بَرّی و بحری سفروں، پردیس کے سمندری مسافروں اور برہنہ جوگیوں کی تاریخ۔

۳۰۔ بڑے بڑے کاریگروں، ماہر دست کاروں، نئی نئی چیزیں بنانے والوں اور طرح طرح کی ایجادیں کرنے والوں کی تاریخ۔

۳۱۔ راہبوں، خانقاہ والوں، خلوت گزینوں کی تاریخ۔

۳۲۔ امام، مؤذن اورعام لوگوں کی تاریخ۔

۳۳۔ رہزنوں، ڈاکوؤں، شطرنج اور نرد کے کھلاڑیوں اور جوئے بازوں کی تاریخ۔

۳۴۔ حسینوں، عاشقوں، عشق بازوں، رقّاصوں، مے نوشوں، بے حیا عورتوں، فاسقوں، دلّالوں، کذّابوں اور مخنثوں کی تاریخ۔

۳۵۔ چالاک، پختہ کار، باتدبیر، اہل رائے، مکّار اور حیلہ باز لوگوں کی تاریخ۔

۳۶۔ دکھاوے کے سخی، شان بگھارنے والے، ہاتھ کی صفائی والے، فرشی، مخنّث غیر پابند اخلاق، جھگڑّا باز، بے حساب ثروت اور موروثی دولت کے مالک، جھوٹے لوگوں کی تاریخ۔

۳۷۔ عقلمند مجنونوں، بہکی بہکی باتیں کرنے والے، مغلوبُ الغضب خلل دماغ والے بے عقلوں کی تاریخ۔

۳۸۔ خیرات۔ بھیک مانگنے والے، درخواستیں کرنے والے، بداطوار اور بدمعاش لوگوں کی تاریخ۔

۳۹ سماعتِ قرآن، عشق، سماع، خوف اور حال سے جان دینے والوں کی تاریخ۔

۴۰۔ کاہنوں اور خرق عادت اور کشف کا مظاہرہ کرنے والوں کی تاریخ۔ جو عموماً فاسق ہوتے ہیں۔

ذہبی کہتے ہیں۔ "یہ چالیس قسم کی تاریخیں ہیں، اگر ان سب کو ایک کتاب میں جمع کیا جائے تو وہ بڑی طول طویل اور پورا بارِ شتر بن جائے گی۔

کتابیات (الف)

محمد بن اسحاق	کتابُ السِّیَر والمغازی
عمرُ الواقدی	کتابُ التّاریخ والمغازی
ابن ہشّام	سیرت الرّسول
محمد بن سعد	الطبقات الکبیر
یعقوبی	معجمُ الادباء کتاب فتوح البلدان
البلاذری	کتاب فتوح البلدان
ابن قتیبہ	الامامۃ والسّیاسۃ
ابوحنیفہ دینوری	اخبار الطّوال
طبری	تاریخ الرسل والملوک
مسعودی	مروج الذہب
ابن مسکویہ	تجارب الامم فی تعاقب الہمم
ابن حزم	"جوامع السیرۃ"
خطیب بغدادی	تاریخ بغداد
ابن صاعد اُندلسی	طبقات الامم
ابن عساکر	تاریخ دمشق
ابن جوزی	المنتظم فی تاریخ الاُمم
ابن اثیر	کتاب الکامل فی التّاریخ
یاقوتِ حموی	معجم الادباء معجم البلدان
ابن خلکان	وفیات الاعیان

ابن طقطقی	کتاب الفخری
ابوالفداء	المختصر فی اخبار البشر
علامہ ذہبی	تاریخ الاسلام و تذکرۃ الحفاظ
ابنِ کثیر	البدایہ والنّہایہ
لسان الدین خطیب	الاحاطہ فی اخبار غرناط
ابن خلدون	کتاب العبر
المقریزی	المواعظ والاعتبار بذکر الخطط والآثار
حافظ ابن حجر عسقلانی	الاصابہ فی تمیز الصّحابہ
سخاوی	الاعلان بالتوبیخ
جلال الدّین سیوطی	الاصابہ فی تمیز الصّحابہ
جلال الدین سیوطی	الدرر الکامنہ
المقری	نفح الطیب
حاجی خلیفہ	کشف الظنون

کتابیات (ب)

مصنّف	تصنیف
عبدالعزیز دوری	علم التاریخ عندالعرب
محمد عبدالمغیث تیموی	اسلامی انسائیکلو پیڈیا
محمد سعید احمد ایم اے	غلامانِ اسلام
علامہ شبلی نعمانی	سیرت النبیؐ جزوِ اوّل
احمد حسن زیات (مترجم عبدالرحمان طاہر سورتی)	تاریخ ادب عربی
ابن خلدون (مترجم: ڈاکٹر عنایت اللہ)	تاریخ ابن خلدون (جلد اوّل)
عبدالحمید صدیقی	اسلام کا فلسفۂ تاریخ
مولانا ابوالاعلیٰ مودودی	خلافت و ملوکیت

ضمیمہ

نام مؤرخ	سن پیدائش	سن وفات
محمد بن اسحاق	سنہ ۸۵ھ	سنہ ۱۵۰ھ
عمر الواقدی	سنہ ۱۳۰ھ	سنہ ۲۰۷ھ
ابنِ ہشام	سنہ ۱۲۳ھ	سنہ ۲۱۳ھ
محمد بن سعد	سنہ ۱۶۸ھ	سنہ ۲۳۰ھ
یعقوبی	نامعلوم	سنہ ۲۴۸ھ
البلاذری	سنہ ۲۰۳ھ	سنہ ۲۷۹ھ
ابن قتیبہ	سنہ ۲۱۳ھ	سنہ ۲۷۶ھ
ابوحنیفہ دینوری	سنہ ۲۰۰ھ	سنہ ۲۸۰ھ
طبری	سنہ ۲۲۵	سنہ ۳۱۰ھ
مسعودی	نامعلوم	سنہ ۳۴۶ھ
ابنِ مسکویہ	سنہ ۳۳۰ھ	سنہ ۴۲۱ھ
ابنِ حزم	سنہ ۳۸۵ھ	سنہ ۴۵۶ھ
خطیب بغدادی	سنہ ۳۹۲ھ	سنہ ۴۶۳ھ
ابن صاعد اندلسی	سنہ ۴۲۰ھ	سنہ ۴۶۲ھ
ابنِ عساکر	سنہ ۴۹۹ھ	سنہ ۵۷۱ھ
ابنِ جوزی	سنہ ۵۱۰ھ	سنہ ۵۳۹ھ
ابنِ اثیر	سنہ ۵۵۰ھ	سنہ ۶۳۰ھ
یاقوت حموی	سنہ ۵۷۵	سنہ ۶۲۶ھ
ابنِ خلکان	سنہ ۶۰۸ھ	سنہ ۶۸۰ھ

ابن طقطقی	سنہ ۶۶۰ھ	سنہ ۷۰۲ھ
ابوالفدار	سنہ ۶۷۲ھ	سنہ ۷۳۲ھ
علامہ ذہبی	سنہ ۶۷۳ھ	سنہ ۷۴۸ھ
ابن کثیر	سنہ ۷۰۰ھ	سنہ ۷۷۴ھ
لسان الدین خطیب	سنہ ۷۱۳ھ	سنہ ۷۷۶ھ
ابن خلدون	سنہ ۷۳۲ھ	سنہ ۸۰۸ھ
المقریزی	سنہ ۷۶۶ھ	سنہ ۸۴۵ھ
حافظ ابن حجر عسقلانی	سنہ ۷۷۳ھ	سنہ ۸۰۲ھ
سخاوی	سنہ ۸۳۱ھ	سنہ ۹۰۲ھ
جلال الدین سیوطی	سنہ ۸۴۹ھ	سنہ ۹۱۱ھ
المقری	سنہ ۱۰۰۱ھ	سنہ ۱۰۴۱ھ
حاجی خلیفہ	سنہ ۱۰۱۶	نامعلوم